Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون 1978

کمیونزم کے سیلاب کو کون
روک سکتا ہے؟

پیش کردہ: ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ-۲ لاہور

قیمت فی پرچہ: 2 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ لاہور

جلد ۳۱	جون ۱۹۷۰ء	شمارہ ۶
بدلِ اشتراک سالانہ پاکستان ۔۔۔ ۲۴/- روپے غیر ممالک ۔۔۔ ۳ پونڈ	ٹیلی فون نمبر ۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور	قیمت فی پرچہ ۲ دو روپے

فہرست

۱۔ لمعات ۔ "ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں" ۔۔۔ ۲

۲۔ "جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ" ۔۔۔۔۔۔ ۱۷
(جمہوری حکومت اور اسلامی نظام میں فرق)
(محترم پرویز صاحب)

۳۔ خدا اور قیصر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹

۴۔ ہماری مسجدیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۵

۵۔ حقائق و عبر ۔۔۔ (۱) قائدِ اعظمؒ کا جنازہ ۳۹
(۲) پیشۂ وکالت
(۳) چندہ کیا ہے؟
(۴) کوڑوں کی سزا
(۵) قطعِ ید کی سزا
(۶) خلافتِ راشدہ کے نمونہ کی حکومت

حقائق و عبر (مسلسل) (۷) قرآن مجید میں تحریف۔
(۸) حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت۔
(۹) شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کا عقیدۂ حدیث۔
(۱۰) علاج بالقرآن۔

۶۔ حجِ بدل کی شرعی حیثیت ۔۔۔۔۔۔۔ ۴۷
(پروفیسر رفیع اللہ شہاب)

۷۔ رسول اللہؐ کا نظامِ حکومت ۔۔۔۔۔ ۵۷

۸۔ نقد و تبصرہ ۔۔ (۱) اقبالؒ اور قرآن ۶۳
(۲) افکارِ ملی
(۳) FOOD & HYGIENE IN ISLAM.

ایڈیٹر محمد خلیل ۔ ناشر سراج الحق ۔ مقامِ اشاعت ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد ۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۱۷ اسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

لمعات

"ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

اواخر اپریل (۱۹۷۸ء) میں ہمارے ہمسایہ ملک، افغانستان میں، جو حادثہ (عسکری انقلاب) رونما ہوا ہے وہ متعدد وجوہات کی بنا پر اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم سرِدست صرف ان اثرات کا جائزہ لیں گے جو (شعوری یا غیر شعوری طور پر) اہلِ پاکستان پر مرتب ہوئے ہیں۔ یہاں ایک عرصہ کے نامساعد حالات کی بنا پر، فضا میں مایوسی عام ہو رہی تھی۔ اس واقعہ سے یوں کہیئے جیسے ملک میں غیر محسوس طور پر، خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی ہو۔ مومن اور خوف، دو متضاد عناصر ہیں۔ جماعتِ مومنین کی تو خصوصیت یہ بتائی گئی تھی کہ: فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲/۳۸) ان پر نہ کسی قسم کا خوف طاری ہو سکتا ہے نہ ہراس۔ اس لئے کہ (جیسا کہ ان سے واضح طور پر کہا گیا تھا)۔ انہیں تمام اقوامِ عالم پر غالب رہنا تھا۔ (وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۔ ۳/۱۳۹) وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا۔ (۴/۱۴۱) یہ ہو نہیں سکتا کہ خدا، غیر مسلموں کو مومنین پر غالب کر دے۔

لیکن یہ کچھ مومنین کے متعلق کہا گیا تھا۔ ہم مسلمانوں کے متعلق نہیں۔ وہ تو ہم (مسلمانوں) کے ایمان کو ایمان ہی قرار نہیں دیتا، اسی لئے ہمیں ایمان لانے کا حکم دیتا ہے جہاں کہتا ہے کہ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ۔ (۴/۱۳۶ و دیگر مقامات)۔ "اے وہ لوگو! جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہو اور اپنے آپ کو مومن (یا مسلم) کی حیثیت سے متعارف کراتے ہو۔ تم اللہ۔ اس کے رسول۔ اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو خدا نے اپنے رسول پر نازل کی تھی"۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی بات ہے جس کی وجہ سے، مدعیانِ ایمان سے بھی ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ قرآن کریم نے دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کر دی کہ: وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِاللَّهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ۔ (۱۲/۱۰۶) ان میں سے اکثر کی یہ حالت ہے کہ

وہ ایمان کے مدعی ہونے کے باوجود مشرک کے مشرک ہی رہتے ہیں۔ یعنی دعویٰ ایمان کے بعد شرک' یہ ہے اس کی حقیقی وجہ۔ ہمارے ہاں شرک سے مراد لی جاتی ہے۔ بت پرستی۔ قبر پرستی۔ پیروں فقیروں کے عرس۔ ان سے مرادیں مانگنا۔ بدعتی رسومات وغیرہ ـــــ اور بس۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے، شرک کا مفہوم ان سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ: لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ (۱۸/۲۶) "خدا اپنے حقِ حکومت۔ اپنے احکامات میں کسی کو شریک نہیں کرتا"۔ اس سے واضح ہے کہ احکاماتِ خداوندی کے ساتھ، انسانوں کے خود ساختہ احکام کو ملانا، حقیقی شرک ہے۔ یہ وہ شرک ہے جس کی، دنیا کی تمام مسلمان قومیں عملاً مرتکب ہو رہی ہیں۔ کفر تو یہ ہے کہ سرے سے احکامِ خداوندی سے انکار کر دیا جائے۔ یہ سیکولرازم ہے جس میں جملہ اقوامِ مغرب ماخوذ ہیں۔ لیکن شرک یہ ہے کہ نام حکومتِ الٰہیہ۔ نظامِ خداوندی۔ اقامتِ دین۔ احکامِ خداوندی کا لیا جائے اور عمل انسانوں کے خود ساختہ قوانین پر کیا جائے اور انہیں احکامِ شریعت کہہ کر پکارا جائے۔ ایمان (یا توحید) یہ ہے کہ خالص احکامِ خداوندی کی اطاعت کی جائے۔ اس ایمان کی رو سے فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ان میں انسانی احکام و قوانین کی آمیزش کر دی جائے تو اس سے خوف و ہراس کی وہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس کے متعلق فرمایا کہ: وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ۔ (۲۲/۳۱) جو خدا سے شرک کرے۔ یعنی احکامِ خداوندی میں غیر خداوندی احکام کی آمیزش کر کے اس کا نام دینِ خداوندی رکھ لے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے کوئی شخص آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آ گرے۔ ایسے جیسے کسی پرندے کا نوزائیدہ بچہ اپنے گھونسلے سے نیچے گر جائے اور اسے چیل یا کوا جھپٹ کر لے جائے۔ یا وہ اس خس و خاشاک کی طرح ہو جائے جسے ہوا کا ہر تیز جھونکا (جھکڑ) جس طرف جی چاہے اڑا کر لے جائے ـــــ اس شرکِ جلی کی وجہ سے، آج تمام دنیا کی مسلم اقوام کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ وہ بے بال و پر پرندوں کے نحیف و نزار بچوں کی طرح ہیں کہ جس ناخن دار پرندے کا جی چاہے انہیں دبوچ لے۔ یا ایسے بے وزن کہ ہر جھکڑ انہیں اڑائے اڑائے پھرے۔ عصرِ حاضر کے جھکڑوں میں، کمیونزم کا جھکڑ سب سے زیادہ تندی اور تیزی کے ساتھ آتا ہے اور ہر خس و خاشاک کو اپنے ساتھ اڑا کر لے جاتا ہے۔ اس جھکڑ کی آمد کے احساس سے ہم پر جو خوف طاری ہو رہا ہے اس کی یہ وجہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جھکڑ آتا کس طرح سے ہے؟ کسی خاص خطۂ زمین پر شدتِ حرارت سے وہاں کی ہوا گرم ہو کر اوپر کو اٹھ جاتی ہے اور اس طرح وہاں خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ کارگہِ فطرت میں خلا محال ہوتا ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے اِدھر اُدھر کی ہوائیں نہایت تندی اور تیزی سے ہجوم کر کے ادھر آتی ہیں۔ اسے جھکڑ کہتے ہیں۔

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ کمیونزم کے جھکڑ کو، مسلم ممالک کی فضا کیوں زیادہ راس آتی ہے؟ اس لئے کہ ان ممالک میں جس قسم کا مذہب عام کیا جاتا ہے اس سے دین و دانش دونوں میں خلا واقع

ہو جاتا ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے اس قسم کے جھکڑ ہجوم کر کے آ جاتے ہیں۔ اس مذہب کی جگہ اگر دینِ خداوندی متمکن ہو تو اس قسم کے جھکڑ غاروں میں منہ چھپاتے پھریں۔ تاریخ کے اوراق سے پوچھئے کہ جب (اسلام کے صدرِ اوّل میں) دینِ خداوندی متمکن ہوا تھا تو ایران کی مزدکیت (کمیونزم) اور روم کی سرمایہ داری کس طرح لرزاں و ترساں تھی۔

یاد رکھیئے! مغرب کا نظامِ سرمایہ داری ہو یا روس اور چین کی کمیونزم یا اشتراکیت۔ ان کا توڑ صرف قرآن کا نظامِ زندگی ہے۔ آج علامہ اقبالؒ ہم میں موجود نہیں۔ لیکن ان کی قرآنی نگہ، بصیرت نے بہت عرصہ پہلے اس خطرہ کو بھانپ لیا تھا اور واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ ابلیس، نہ مغرب کے جمہوری نظامِ سرمایہ داری سے خائف ہے، نہ روس کی کمیونزم سے۔ وہ خائف ہے دینِ خداوندی سے۔ اس خطرہ کے ازالہ کے لئے اس کی تدبیر یہ ہے کہ مسلمان کو موجودہ مذہب میں اور زیادہ راسخ اور پختہ کر دیا جائے۔ ارمغانِ حجاز میں ان کی بصیرت افروز اور حقائق پرور نظم۔ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ــــ یوں تو اس قابل ہے کہ اسے نژادِ نو کے نصابِ تعلیم میں شامل کر دیا جائے۔ لیکن اس وقت ملک میں جو فضا مسلط ہو رہی ہے، اس کے پیشِ نظر اس کا خصوصی مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ اس میں مرض کی تشخیص بھی ہے اور علاج بھی۔ ہم اس کا وہ حصہ پیشِ خدمتِ قارئین کرتے ہیں جس کا تعلق موجودہ جھکڑ سے ہے۔

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ (کابینہ) کا ایک مشیر کہتا ہے کہ ہمارے (ابلیسی) نظام کو تہ و بالا کرنے کے لئے اس سے پہلے جو خطرات اُبھرے ان کا تو ہم نے ازالہ کر دیا۔ لیکن اب جو خطرہ (کمیونزم کی شکل میں) نمودار ہو رہا ہے، اس سے ہم بہت خائف ہیں۔ یہ ہمیں لے ڈوبے گا۔ اس نے کہا: ؎

وہ یہودی فتنہ گر[1] وہ روحِ مزدک[2] کا بروز — ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار
زاغِ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ — کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار!
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر — جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار
فتنہ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج — کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ابلیس نے اسے نہایت سکوت اور سکون کے ساتھ سنا اور کامل اطمینان و اعتماد کے ساتھ کہا کہ تمہارے یہ خدشات موہوم ہیں۔ یہ کمیونسٹ وقتی طور پر ہنگامے برپا کر سکتے ہیں۔ کوئی ایسا مثبت نظام قائم نہیں کر سکتے جو ہمارے تخلیق کردہ نظامِ سرمایہ داری کی جگہ لے سکے۔ سُن رکھو کہ: ؎

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک — مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

---

[1] اشتراکیت کا بانی کارل مارکس۔
[2] زمانہ قبل از اسلام میں، ایرانی اشتراکیت کا بانی۔

لہٰذا:۔

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد　　یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو

تمہاری نگاہ بڑی سطحی ہے۔ ہمارے لئے اشتراکیت خطرہ کا موجب نہیں۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے　　جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیتؔ فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

جب ابلیس نے کہا کہ مجھے کمیونسٹوں سے نہیں بلکہ اُمّتِ مسلمہ سے حقیقی خطرہ ہے تو اس کے سطح بین مشیروں کے لب پر خفیف سی ہنسی پھیر گئی۔ اس نے ان کے وساوس کو بھانپا تو کہا کہ تمہارے دل میں جو خیالات گذر رہے ہیں، میں ان سے اچھی طرح باخبر ہوں۔ تم یہی خیال کر رہے ہو نا، کہ یہ مسلمان جن کا شمار دنیا کی زندہ قوموں میں ہی نہیں، یہ ہمارے لئے کس طرح خطرہ کا موجب ہو سکتے ہیں۔ میں اس حقیقت سے واقف ہوں:۔

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں　　ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں　　بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

اس اُمّت کی بے شک، یہی حالت ہے:۔

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف　　ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

اس وقت تک میں نے شرعِ پیغمبرؐ (یعنی قرآنی نظام) کو بڑے تلبیسانہ انداز سے چھپائے رکھا ہے۔ دینِ خداوندی کی جگہ میں نے انہیں بے روح مذہبی کھلونے دے رکھے ہیں جن سے یہ اپاہج بہلاتے رہتے ہیں۔ لیکن مجھے خطرہ ہے کہ زمانے کے تقاضے اس دین کو بے نقاب نہ کر دیں۔ اگر وہ دین بے نقاب ہو گیا تو پھر ہمارا کہیں ٹھکانہ نہیں۔ تمہیں معلوم نہیں کہ وہ دینِ خداوندی۔ وہ آئینِ پیغمبرؐ۔ کس قسم کی تیغِ بے نیام ہے:۔

الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر　　حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں!
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے　　نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف　　منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

تم خود غور کرو کہ یہ دین کس قسم کا انقلابی نظام لائے گا۔ ایسا نظام جس میں ابلیسی سیاست کے کسی گوشے کو بھی دخل نہیں ہوگا۔ اس میں نہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہوگا، نہ محتاج۔ اس میں نہ آمریت ہوگی نہ مغربی جمہوریت۔ نہ سرمایہ داری ہوگی نہ اس کی پشت پناہ مذہبی پیشوائیت۔ اس لئے:۔

ہ ا کمیونزم۔

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب   یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

اس لئے ہمارے حق میں یہی بہتر ہے کہ یہ اُمت موجودہ مذہب اور تصوف کی بھول بھلیوں میں اُلجھی رہے اور دینِ خداوندی کی طرف اس کی نگاہ اُٹھے ہی نہیں۔

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے   یہ کتابُ اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے
توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات   ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

یہ سن کر ابلیس کے مشیروں نے کہا کہ اب ہماری سمجھ میں آگیا ہے کہ ابلیسی نظام کے لئے خطرہ کا گوشہ کونسا ہے۔ یہ تو ہم نے سمجھ لیا۔ اب آپ یہ بتائیے کہ اس خطرہ سے محفوظ رہنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے! ابلیس نے کہا کہ اس کے لئے کسی لمبے چوڑے پروگرام کی ضرورت نہیں۔ کرنے کا کام فقط یہ ہے کہ مسلمان جس مذہب کو اسلام سمجھے ہوئے ہے، اسے اس میں اور مجذوب کر دو۔ اسے اس قسم کے مسائل میں الجھائے رکھو کہ: ؎

ابنِ مریمؑ مر گیا، یا زندۂ جاوید ہے؟   ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے   یا مجدّد، جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلامُ اللہ کے الفاظ حادث، یا قدیم   امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

اس نے کہا کہ سوچو: ؎

کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں   یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

تم اسے اس قسم کے نظری مسائل کی بحث و مناظرہ میں الجھائے رکھو اور اس کے اس یقین کو اور پختہ کر دو کہ اسلام کی حقیقی خدمت یہی ہے۔ تم اسے ان بیکار مباحث کو زیادہ سے زیادہ مزیّن بنا کر دکھاؤ اور اس طرح: ؎

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے   تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام   چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر   جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

پھر سمجھ لو اور اچھی طرح سمجھ رکھو کہ دنیا کے کسی نظام میں ہمارے لئے خطرہ نہیں۔ خطرہ ہے تو اس سے کہ یہ اُمت کہیں اس نظامِ قرآنی کو لے کر اُٹھ نہ کھڑی ہو۔ ؎

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں   ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اس کے لئے تمہیں یہ کرنا ہوگا ـــــ اور ایسا کرنے میں ہر "مقدس" حربہ استعمال کرنا ہوگا کہ: ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

تم مسلمان کو باور کرا دو کہ جس مذہب کے تم پرستار ہو یہی مذہب عین اسلام ہے۔ تمہاری تباہی اس مذہب کو چھوڑ دینے سے ہوئی ہے۔ اس کے دوبارہ احیاء میں تمہاری حقیقی خدا پرستی کا راز پوشیدہ ہے۔ پہلے تم اس مذہب کی ترویج انفرادی طور پر کرتے تھے۔ اب تم آزاد ہو اس لئے، اسے قوانینِ مملکت کی حیثیت سے رائج کر دو۔ اس سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوگی اور تمہاری عاقبت سنور جائے گی۔

یہ تھی "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کی وہ روئداد جسے حکیم الامتؒ نے، اپنی زندگی کے آخری سانسوں میں مرتب کیا تھا۔ اس روئداد سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ موجودہ مذہب جس قدر زیادہ عام ہوگا، ملت کے نظام میں خلا پیدا ہو جائے گا' جسے پُر کرنے کے لئے سیکولرازم اور کمیونزم جیسے جھکڑ ہجوم کر کے آجائیں گے۔ اس خطرہ سے بچنے کے لئے اقبالؒ نے مملکتِ پاکستان کا تصور دیا تھا تاکہ اس میں قرآنی نظام نافذ کیا جا سکے جو نہ صرف ان جھکڑوں کو اس طرف آنے سے روک دے بلکہ ساری دنیا کو دکھا سکے کہ شرفِ انسانیت کا راز اسی نظام میں مضمر ہے اور اس کے سوا تمام نظام، خواہ وہ مغربی جمہوریت کا سیکولر نظام ہو، خواہ سرمایہ داری یا جاگیرداری کا نظام۔ اور خواہ کمیونزم کا اشتراکی نظام۔ انسانیت کے لئے موت کا سامان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ لیکن وائے برحالِ ما، کہ بجائے اس کے کہ یہاں قرآنی نظام نافذ ہو، مروجہ مذہب کی اکاس بیل چڑھتے سورج کی دھوپ کی طرح پھیلتی چلی گئی جو اس قسم کے مرگ آفریں جھکڑوں کو آوازیں دے دے کر بلاتا ہے۔ یہاں جس قسم کے مذہب کو عام کیا گیا اس کی تفصیل میں جانے کے لئے ایک ضخیم تصنیف کی ضرورت ہوگی۔ ہم یہاں مثال کے طور پر اس کے چند ایک گوشوں کی خفیف سی جھلکیاں سامنے لاتے ہیں۔

دین، عقل کو جلاؔ اور علم کو فروغ عطا کرتا ہے۔ لیکن یہاں جس قسم کے مذہب کی تعلیم عام کی گئی وہ توہم پرستیوں کا مجموعہ تھا۔ دو چار مثالیں ملاحظہ فرمائیے:۔

توہم پرستی

۱۔ ڈاڑھی (سنتِ رسولؐ) کا استہزا

پشاور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ۔ صدائے اسلام۔ کی ۲۱ر جولائی ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں عنوانِ بالا کے تحت ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں کہا گیا تھا:۔

> حضرت مولانا عبدالعزیز خطیب زرعی فارم ساہیوال فرمایا کرتے ہیں کہ مکہ معظمہ میں ایک بڑے عالم رہا کرتے تھے۔ جماع کے بعد تہجد کے وقت جب وہ غسل کرتے تو پیرانہ سالی کے سبب ان پر کپکپی طاری ہو جاتی اور وہ کہتے شریعت نے خواہ مخواہ غسل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر غسل کا حکم نہ ہوتا تو کیا حرج تھا۔ وفات کے بعد ان کو مکہ معظمہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ مدت کے بعد ان کی قبر (ہڈیاں نکالنے کے لئے) کھودی گئی تو دیکھا کہ ایک عورت کی لاش ہے۔ لوگوں کو بڑا تعجب ہوا کہ مولوی صاحب تو عالم باعمل اور نیک آدمی تھے۔ ان کی اہلیہ سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے بتلایا کہ مولوی صاحب تو واقعی نیک آدمی تھے لیکن غسل کے بعد مذکورہ بالا الفاظ کہتے تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ واقعی یہ اس کی سزا ہے۔ اندازہ فرمائیں کہ شریعت کی تحقیر کا کیا انجام ہوا! ؏۔ غور سے سن داستان ان کی!۔ حجاج میں سے ایک شخص نے اس عورت کی لاش پہچانی اور کہا کہ یہ انگلستان کی رہنے والی تھیں،

اور مسلمان ہو چکی تھیں ـــــ ان کے خاندان کے سب افراد عیسائی تھے۔ چنانچہ ان کی نشاندہی پر انگلستان ایک عالم صاحب گئے اور عورت کے والدین سے ملے اور اس کے والدین کو ساتھ لے کر اس عورت کی قبر اکھاڑی گئی تو دیکھا کہ مولوی صاحب کی لاش موجود ہے جن کو مکہ معظمہ میں دفن کیا گیا تھا۔ اس درج فرسا واقعہ سے داڑھی منڈے عبرت حاصل کریں اور داڑھی کا استہزا و تضحیک چھوڑ دیں ورنہ امت محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں محشور نہ ہوں گے۔

۲۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ

روزنامہ مشرق (لاہور) کی ۲ مارچ ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں شائع شدہ ایک مقالہ میں تحریر تھا:۔

حضرت بابا صاحب (بابا فرید الدین گنج شکرؒ) بارہ برس تک صائم رہے۔ اس عرصہ میں نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ گلے میں ایک کاٹھ کی روٹی ڈال رکھی تھی۔ جب بھوک غلبہ کرتی تو آپ روٹی پر دانت مارتے۔ بارہ سال کی ریاضت کے بعد جب والدہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے لکڑی کے سہارے کو بھی بُرا منایا اور کہا کہ ابھی تم پر نفس غالب ہے۔ جاؤ اور بغیر چوبی روٹی کے صائم رہو۔ چنانچہ انہوں نے کاٹھ کی روٹی پھینک دی اور پھر بارہ سال تک صائم رہے۔

انہی کے متعلق روزنامہ جاوداں کی اشاعت بابت ۲۴ فروری ۱۹۷۶ء میں کہا گیا تھا:۔

آپ نے بہت سخت سے سخت مجاہدے کئے، چلہ معکوس بھی کاٹا۔ یعنی بارہ سال کنوئیں میں لٹک کر نماز معکوس ادا کی (اس کا طریقہ یہ ہے کہ چلہ کرنے والا رات کو پاؤں میں رسی باندھ کر کنوئیں میں الٹا لٹک جاتا ہے اور عبادت میں مصروف رہتا ہے ـــــ ناقل)۔ جواہر فریدی میں لکھا ہے کہ اس زمانہ میں حال ریاضت اور استغراق درجۂ فنا میں یہاں تک پہنچے کہ چڑیوں اور جانوروں نے آپ کے پاؤں اور وجود مبارک میں گھونسلے بنا لئے تھے۔

۳۔ ایک وصیت

مولانا احمد شاہ نورانی (صدر جمعیت العلماء پاکستان) جس فرقہ (بریلوی) کے نمائندہ ہیں، اس کے بانی، مولانا احمد رضا خاں (مرحوم) نے اپنی وفات سے دو گھنٹے پہلے جو وصیتیں فرمائیں ان میں ایک وصیت یہ بھی تھی کہ ان کی وفات کے بعد، ان کی فاتحہ میں کس کس قسم کی چیزیں رکھی جائیں۔ فرمایا۔

اعزہ سے اگر بطیب خاطر ممکن ہو تو فاتحہ ہفتہ میں دو تین بار ان اشیاء سے بھی کچھ بھیج دیا کریں۔ دودھ کا برف خانہ ساز۔ اگر بھینس کا دودھ ہو۔ مرغ کی بریانی۔ مرغ پلاؤ خواہ بکری کا ہو۔ شامی کباب پراٹھے اور بالائی۔ فیرینی۔ اُردکی پھریری دال مع ادرک و لوازم۔ گوشت بھری کچوریاں۔ سیب کا پانی۔ انار کا پانی۔ سوڈے کی بوتل۔ دودھ کا برف۔ (وصایا شریف، مطبوعہ نوری کتب خانہ لاہور بحوالہ دھماکہ ص ۱۹)

۴- کوّا، حلال ہے یا حرام

یہ حضرات کس قسم کے مہمات مسائل کا حل کرنے میں مصروف رہتے ہیں؟ اس کی بھی ایک مثال ملاحظہ فرما لیجئے۔ راولپنڈی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ انصاف کی ۲۶ اگست ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ:-

ضلع سرگودھا میں ہزاروی گروپ سے متعلق مولوی صاحبان نے یہ ثابت کیا کہ کوّا حلال ہے اور پھر اس نظری فتویٰ کو عملی شکل دینے کے لئے کوّے ذبح کئے اور ان کا گوشت پکا کر کھایا۔ اس کے بعد اب مختلف فرقوں میں یہ بحث چل پڑی ہے کہ ـــــ کوّا حلال ہے یا حرام۔

فرمائیے! قوم کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اس "اسلام" پر الحاد اور بے دینی کو ترجیح نہیں دے گا تو اور کیا کرے گا؟

غلام اور لونڈیاں

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کو سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ وہ انہیں بالا نکاح اور بلا حدِ تعداد اپنے استعمال میں لائیں گے۔ اس کے بعد جب جی چاہے انہیں دوسروں کی طرف منتقل کر دیں گے۔ حتیٰ کہ انہیں فروخت بھی کر سکیں گے۔ اس کی پوری تفصیل ان کی کتاب ـــــ تفہیمات۔ حصہ دوم۔ اگست ۱۹۵۱ء ایڈیشن۔ صفحات ۲۹-۳۲۴ میں "غلامی کا مسئلہ" کے عنوان کے تحت درج ہے۔ نیز انہوں نے اسے اپنی تفسیر، تفہیم القرآن کی پہلی جلد میں بھی دہرایا ہے ـــــ ۱۹۵۱ء ایڈیشن۔ صفحہ ۳۴۰۔

کم از کم ایک لونڈی!

جمعیت العلماء اسلام کے رکنِ اسمبلی، مولانا نعمت اللہ صاحب نے اسمبلی میں اپنی تقریر کے دوران فرمایا:-

غلامی کو منسوخ کرنا خلافِ اسلام ہے۔ جو شخص ایک سے زیادہ بیویوں کی استطاعت نہ رکھتا ہو، ایسا انتظام کیا جائے کہ وہ کم از کم ایک لونڈی رکھ سکے۔ (پاکستان ٹائمز۔ یکم مارچ ۱۹۷۳ء)

سربراہِ مملکت کا نیلام

لاہور سے شائع ہونے والے ماہنامہ محدّث کے شمارہ، بابت محرم۔ صفر ۱۳۹۵ھ میں ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا ـــــ علماءِ حق کے لئے لمحۂ فکریہ ـــــ اس کی ابتدا ان سطور سے ہوئی تھی۔

علمائے کرام، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وارث، دینِ نبی کے ترجمان، صداقتِ اسلام کے

شاہد، طائفہ منصورہ کی جان، اور ملتِ اسلامیہ کے اصل نمائندے ہوتے ہیں۔ یہ وہ اعزاز ہے جو بیک وقت کسی ایک طبقہ کو ایک سانحہ مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ سے انہیں ناقابلِ تسخیر محاذ اور قابلِ صد رشک اعزاز تصور کیا جاتا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ گروہِ سعید اس احترام، اکرام، اعتماد اور عزت کا اہل بھی ہے۔ کثرھم اللہ سوادھم۔

اس کے بعد علماء سے کہا گیا کہ وہ اپنے مقام کو پہچانیں اور اس کی بازیابی کے لئے متحد ہو جائیں۔ اگر انہوں نے اس مقام کو حاصل کر لیا تو مملکت میں ان کے اقتدار کا کیا عالم ہوگا، اس کی وضاحت کے لئے ایک واقعہ درج کیا گیا۔ اسے غور سے سنئے۔ لکھتے ہیں:۔

مصری حکومت کا ایک نائب السلطنت اصل میں غلام تھا جو کسی طرح برسرِ اقتدار آگیا تھا۔ غلام اصل میں اسلامی بیت المال کی ملکیت ہوتے ہیں اس لئے حضرت امام عزالدین بن عبدالسلام نے اعلان کیا کہ یہ شخص بیت المال کی جائیداد ہے اور شرعی طریقے پر آزاد نہیں کیا گیا۔ چنانچہ اس فتوے سے بڑی کھلبلی مچ گئی۔ حکام نے بلا کر پوچھا کہ آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟ فرمایا:۔

ہم ایک مجلس طلب کریں گے اور بیت المال کی طرف سے آپ کو نیلام کریں گے اور شرعی طریقہ پر آپ کو آزادی کا پروانہ دیا جائے گا۔ انہوں نے جاکر بادشاہ سے کہا کہ یہ شیخ ہمیں ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے بڑی کوشش کی مگر شیخ نے اپنے الفاظ واپس لینے سے انکار کر دیا جس سے برہم ہو کر شاہ سے شیخ کی شان کے خلاف کوئی غیر محتاط جملہ نکل گیا۔ آپ نے سن کر وہاں سے کوچ کر دیا۔ پھر کیا تھا، سارے شہر میں کہرام مچ گیا اور بادشاہ کو خود جاکر منتوں سے واپس لانا پڑا اور بالآخر یہ طے ہوا کہ:۔

وہ امرادِ سلطنت کو خود نیلام کریں۔

نائب السلطنت نے جلال میں آکر کہا کہ میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ تلوار لے کر شیخ کے دروازہ پر پہنچا۔ دستک دی۔ شیخ کا بیٹا آیا۔ دیکھا کہ نائب السلطنت تلوار سونتے کھڑا ہے۔ جاکر بتایا تو شیخ نے کہا کہ:۔

بیٹا! آپ کا باپ اس قدر خوش نصیب کہاں کہ اس کو شہادت ملے۔ پھر باہر نکلے تو دیکھتے ہی نائب السلطنت کے ہاتھ سے تلوار گر گئی اور بدن پر رعشہ طاری ہو گیا۔ اور پاؤں میں گر گیا اور کہا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں، فرمایا آپ کا نیلام! پھر فرمایا رقم کس مد میں ڈالیں گے؟ فرمایا۔ مسلمانوں کے کاموں میں۔ پوچھا۔ قیمت کون وصول کرے گا؟ فرمایا۔ میں خود۔ اس نے کہا۔ بہت اچھا! چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک ایک امیر کو نیلام کیا گیا اور ہر ایک کی بولی بولی گئی۔ اور قیمت وصول کر کے وہ خیر کے کاموں میں صرف کی گئی۔

(طبقات الشافعیہ۔ ماخوذ از تاریخ دعوت وعزیمت)

جنسیات

جنسیات ان حضرات کا خاص موضوع ہوتا ہے اور اس کے متعلق وہ بڑی تفصیل سے تصریحات بیان کرتے رہتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ عورت کی ان حضرات کے نزدیک حیثیت کیا ہے۔ جماعت اہل حدیث کے ایک ترجمان، ہفت روزہ منہاج کی ۷/۲۱ ستمبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں، حضرت داتا گنج بخشؒ سے متعلق ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ عورت کے متعلق داتا صاحبؒ فرماتے ہیں:-

> بہشت میں سب سے پہلا فتنہ جو آدم پر مقدر ہوا اس کا اصل بھی عورت تھی۔ پہلے پہل جو فتنہ دنیا میں ظاہر ہوا یعنی ہابیل قابیل کی لڑائی۔ اس کا سبب بھی عورت تھی۔ اور جب خدا نے چاہا کہ دو فرشتوں (ہاروت ماروت) کو سزا دے تو اس کا سبب بھی عورت ہی کو قرار دیا گیا۔ اور آج دینی اور دنیاوی فتنوں کے تمام اسباب کا ذریعہ بھی عورتیں ہیں۔

نابالغ لڑکی سے خلوت

مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن۔ جلد پنجم۔ صفحہ ۵۷۱ (طبع اوّل) پر لکھتے ہیں کہ نابالغ لڑکیوں سے نہ صرف نکاح جائز ہے بلکہ شوہر کا ان کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔

نابالغ لڑکی سے خلوت! عائلی قوانین کے خلاف ان حضرات نے جو طوفان بپا کیا تھا وہ آپ کو یاد ہوگا۔ ان کے خلافِ شریعت ہونے کی ایک دلیل یہ بھی دی جاتی تھی کہ ان کی رو سے نکاح کے لئے لڑکی کے بالغ ہونے کی شرط عائد کی گئی تھی۔

جنت کی حوریں

مودودی صاحب سے دریافت کیا گیا کہ جنت کی حوریں کون ہوں گی، تو آپ نے جواب دیا:-

> کفار کی لڑکیاں جو کم سنی میں وفات پا گئی ہوں گی انہیں جنت میں حوریں بنا دیا جائے گا۔
> (ایشیا۔ ۱۴ر جون ۱۹۶۹ء)

انہوں نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن۔ جلد پنجم۔ طبع اول صفحہ ۲۷۱۔ میں اس پر یہ اضافہ فرمایا ہے:-

> اہلِ جنت کی بیویاں ان کے ساتھ قصروں میں رہیں گی اور ان کی سیرگاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے جن میں حوریں ان کے لئے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی۔

جنت کی عورتوں کے متعلق کتب روایات و تفاسیر میں اس سے بھی زیادہ "دلچسپ" کوائف درج ہوتے ہیں۔ مشکوٰۃ المصابیح حدیث کا مشہور اور بڑا مستند مجموعہ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ، مولوی نور محمد، کارخانہ تجارت کتب۔ کراچی نے چھاپا تھا۔ اس کی دوسری جلد میں جنت کی تفاصیل بڑی وضاحت سے دی گئی ہیں۔ اس میں ایک حدیث میں ہے:-

(حضرت) انسؓ کہتے ہیں۔ نبی صلعم نے فرمایا ہے۔ جنت میں مومن کو جماع کی اتنی قوت عطا کی جائے گی۔ (یعنی مثلاً دس عورتوں سے جماع کرنے کے وقت)۔ پوچھا گیا، یا رسول اللہ (صلعم) کیا مرد کو اتنی عورتوں سے جماع کرنے کی قوت ہوگی؟ فرمایا۔ جب مرد کو سو مردوں کے برابر قوت عطا کی جائیگی تو پھر وہ کیوں اتنی عورتوں سے جماع کی قوت نہ رکھ سکے گا۔ (ترمذی) (مشکوٰۃ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۲۹)

• ابن کثیر، تفسیر کی ایک نہایت مستند کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے:۔

حضرت ابوطفیلؓ فرماتے ہیں کہ جنتیوں کے سروں پر ابر آئے گا اور انہیں ندا ہوگی کہ بتلاؤ۔ کس چیز کا برسنا چاہتے ہو؟ پس جو لوگ جس چیز کا برسنا چاہیں گے وہی چیز ان پر اس بادل سے برسے گی۔ یہانتک کہ کہیں گے کہ ہم پر ابھرت ہوئے سینے والی ہم عمر عورتیں برسائی جائیں۔ چنانچہ وہی برسیں گی۔ اس لئے فرمایا کہ فضل کبیر یعنی زبردست کامیابی۔ کامل نعمت یہی ہے۔

(اردو ترجمہ تفسیر ابن کثیر۔ از مولانا محمد جوناگڑھی۔ پارہ پچیسواں۔ صفحہ ۱۱)

معاشیات

سب سے اہم مسئلہ معاشیات کا ہے۔ یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ ہمارا زمانہ ہی دورِ اقتصادیات (AGE OF ECONOMICS) کہلاتا ہے۔ کمیونزم سے اصل ٹکراؤ اسی میدان میں ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کے مذہبی حلقوں سے یہ آواز مسلسل اور متواتر بلند کی جاتی ہے کہ معاشیات کا حل نہ نظام سرمایہ داری میں مل سکتا ہے نہ اشتراکیت میں۔ اس کا حل صرف اسلامی نظام پیش کر سکتا ہے۔ یہ الفاظ تو اٹھتے بیٹھتے دہرائے جاتے ہیں، لیکن یہ (اسلامی) نظام ہے کیا؟ اسے متعین طور پر کوئی نہیں بتاتا۔ مودودی صاحب نے البتہ اس کے نمایاں خط و خال اپنی مشہور کتاب "مسئلہ ملکیتِ زمین" میں بیان کئے ہیں۔ ہم اس کے (پہلے ایڈیشن سے اخذ کردہ) اہم اقتباسات درجِ ذیل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ (پہلا ایڈیشن۔ صفحہ ۵۲) (پھر) جس طرح وہ (اسلام) ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کارخانہ، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ ..... (نیز) وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اُجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی

نہیں ہیں۔ (صفحہ ۷۳)

قومی ملکیت یا (NATIONALISATION) کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ:-

اس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد ہی نہیں کر سکا۔ (صفحہ ۷۱)

یہ ہے اقتصادیات کا وہ نظام جسے یہ حضرات اسلام کا معاشی نظام کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ اور جسے عالمگیر انسانیت کی مشکلات کا حل قرار دیتے ہیں۔ اس پر جب یہ کہا گیا کہ اس طرح جب رزق کے تمام ذرائع افراد کی ملکیت میں آجائیں گے اور وہ بے حد و نہایت دولت کے انبار جمع کرتے چلے جائیں گے، تو غریبوں اور مفلسوں کے فاقوں کا کیا علاج ہوگا؟ اس کے جواب میں، یہ حضرات نہایت معصومیت سے فرمادیا کرتے ہیں کہ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ وہ جسے چاہے امیر کبیر بنا دے۔ جسے چاہے مفلس اور غریب رکھے۔ غریبوں اور محتاجوں کا اپنے افلاس کے خلاف شکوہ و شکایت درحقیقت خدا کے (تقسیمِ رزق کے) اختیارات کے خلاف احتجاج ہے جو الحاد اور بے دینی ہے۔ اس قسم کا حرف زبان پر لانا تو ایک طرف، اس کا تصور تک بھی دل میں نہیں کرنا چاہیئے۔ فروری ۱۹۷۶ء میں، مسجدِ نبوی (صلعم) کے امام اور وہاں کے چیف جسٹس شیخ عبدالعزیز صالح، پاکستان تشریف لائے۔ کراچی پہنچنے پر ان کا ایک انٹرویو لیا گیا۔ اس میں ان سے سوال کیا گیا کہ:-

اکثر کہا جاتا ہے کہ چوری، لوٹ مار وغیرہ کا سبب معاشرہ میں لوگوں کے درمیان اقتصادی اور معاشی تفاوت ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

اس کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا۔ وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ فرمایا:-

یہ بات وہ لوگ کہتے ہیں جن کا نہ خدا پر اعتقاد ہے اور بہ قیامت پر یقین رکھتے ہیں۔ جو ایمان کی شیرینی سے ناآشنا ہیں، وہ خدا سے پھر گئے ہیں۔ اللہ نے اُن سے منہ پھیر لیا ہے۔ جہاں تک مومن کا تعلق ہے اس کا ایمان ہے کہ جو کچھ دیتا ہے اللہ دیتا ہے۔ آمدنی قلیل ہو یا کثیر، اس پر قناعت کرتے ہوئے اپنی ضرورت کے لئے اللہ سے مانگتا ہے۔ کبھی دعا جلدی قبول نہ بھی ہو تو مایوس نہیں ہوتا۔ اس کا دل اللہ پر اعتماد کی دولت سے غنی ہوتا ہے۔ جو لوگ اللہ پر بھروسہ نہیں رکھتے وہ صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں اور فساد کا سبب ہیں۔

(بحوالہ المنبر ڈائجسٹ۔ فیصل آباد۔ بابت ۱۱/۱۸ فروری ۱۹۷۶ء صفحہ ۳۲)

ذرا سوچیئے کہ جو نوجوان معاش کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہو، اسے اس خدا سے منحرف کرنے میں جس کا تصور اس قسم کا پیش کیا جاتا ہو، کمیونزم کو کچھ بھی دقت پیش آئے گی؟

سردست یہ مذہب انفرادی طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن اب کوشش ہو رہی ہے کہ اسے مملکت کے آئینی اور قانونی نظام کی حیثیت سے نافذ کیا جائے۔ اسے نافذ کرنے کے بعد، صورت کیا ہوگی، اسے مودودی صاحب نے لگی لپٹی رکھے بغیر، دوٹوک الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخِ اعلان سے ایک سال

کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں، مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا۔ اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا، اسے قتل کر دیا جائے گا۔

(کتابچہ "مرتد کی سزا، اسلامی قانون میں"۔ اگست ۱۹۵۲ء ایڈیشن۔ صفحہ ۷)

کیا اس قتلِ عام سے بچنے کیلئے قوم یہ خیال نہیں کرے گی کہ اس دین سے وہ لادینی ہزار درجہ بہتر ہے جس میں کم از کم زندہ رہنے کی تو اجازت ہو گی؟ ان حقائق سے واضح ہے کہ کمیونزم (یا کسی اور لادینی نظام) کا توڑ وہ مذہب قطعاً نہیں ہو سکتا جسے مروجہ اسلام کے نام سے رائج کیا جا رہا ہے اور جسے قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کرنے کے مطالبات پیش کئے جاتے ہیں۔ لادینی کے سیلاب کے سامنے بند باندھنا تو ایک طرف، اس قسم کا مذہب تو لادینی کے سیلاب کو آوازیں دے دے کر بلاتا ہے۔ کمیونزم ہو یا اور کوئی لادینی نظام، اس کا توڑ صرف وہ دین ہو سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اور جو اب اس کی کتاب میں محفوظ ہے۔ اس دین کی تفاصیل میں جانے کے لئے نہ وقت ہے نہ گنجائش۔ طلوعِ اسلام اسے گذشتہ تیس سال سے مسلسل پیش کرتا چلا آ رہا ہے۔

اسلام کا معاشی نظام

اس وقت ہم اس کی صرف ان چند جھلکیوں کو وجہِ فروغِ دیدہ بنانے پر اکتفا کرتے ہیں جب وہ اسلام کے صدرِ اوّل میں متشکل ہوا تھا۔ اس نظام کے اصل الاصول کے طور پر حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ:۔

جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا، اس بستی سے خدا کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔ (مسند امام احمد)

اس ارشادِ نبویؐ میں یہ الفاظ خاص طور پر قابلِ غور ہیں کہ "اس بستی سے خدا کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا"۔ واضح ہے کہ جس مملکت کا نظام یہ ہو کہ اس میں کوئی فرد بھوکا نہ سوئے، وہ ہر خطرہ سے محفوظ اور مامون رہے گی۔ لیکن جہاں یہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ کچھ لوگ پیٹ بھر کر کھا کر سو رہیں اور کچھ لوگ فاقے سے رات کاٹیں، وہ غیروں کی یلغار سے محفوظ نہیں رہ سکتی، اُسے، جس کا جی چاہے جھپٹ کر لے جائے گا۔ کمیونزم تو بالخصوص اس تاک میں رہتا ہے اور ایسے حالات کو فوراً (EXPLOIT) کرتا ہے۔ ایسی تباہی سے محفوظ رہنے کا احساس تھا جس کی رو سے اسلامی مملکت نے اہم احتیاطی تدابیر اختیار کر رکھی تھیں (مثلاً) عہدِ فاروقی میں ایک دفعہ ایک بستی کے رہنے والوں نے ایک پیاسے مسافر کو پانی نہ دیا اور وہ پیاس کی وجہ سے مر گیا تو حضرت عمرؓ نے اس کا خوں بہا خود ادا کیا اور اسے پھر اس بستی والوں سے وصول کیا۔ اسی فاروقی فیصلہ کی رو سے قانون بن گیا کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوک پیاس سے مر جائے تو اہلِ بستی پر اس کی دیت (خون کی قیمت) لازم آ جاتی ہے۔ اس ضمن میں حاطب بن بلتعہ کے غلاموں (ملازموں) کا واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے ایک شخص کا اونٹ ذبح کر کے کھا لیا۔ ان کے خلاف چوری کا جرم ثابت ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے سزا نافذ کرنے سے پہلے ان سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ انہوں نے کہا کہ حاطب ہم سے

کام تو سخت لیتا ہے لیکن کھانے کو اس قدر کم دیتا ہے کہ اس سے ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ ہم نے انتہائی مجبوری کے عالم میں ایسا کیا ہے۔

یہ سن کر آپ نے ان غلاموں کو تو چھوڑ دیا اور حاطب کو بلا کر کہا کہ چاہیئے تو یہ کہ چوری کے جرم میں تمہارا ہاتھ کٹوا دیا جائے کہ اس جرم کے مرتکب تمہارے غلام نہیں، تم ہو۔ جس نے انہیں اس حد تک پہنچا دیا کہ وہ چوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن میں تم سے نرمی برتتا ہوں۔ اس دفعہ تو اتنی ہی سزا کافی سمجھتا ہوں کہ تم اونٹ کی قیمت اس کے مالک کو ادا کر دو۔ اگر آئندہ تمہارے غلاموں کی یہی حالت ہو گئی تو پھر تمہارے لئے کسی سخت سزا کا سوچا جائے گا۔

اس ضمن میں ترمذی کی وہ حدیث ان لوگوں کے لئے قندیلِ راہ کا حکم رکھتی ہے جو ملک کو طبقاتی کش مکش سے محفوظ رکھنے کی تدابیر سوچتے ہیں:۔

نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ کچھ لوگ دریا میں ایک کشتی پر سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے۔ کچھ نیچے کے حصے میں۔ جو نچلے حصہ میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے۔ اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے ہمیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ ہم نیچے سوراخ کر کے پانی حاصل کر لیں گے۔ اب اگر ان نیچے والوں کو اس سے روکا جائے تو ظاہر ہے کہ اوپر اور نیچے والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر روک دیا جائے (یعنی انہیں پانی دے دیا جائے) تو سب بچ جائیں گے۔ (ترمذی۔ جلد دوم۔ باب فتن)

اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ سامانِ رزق (ملی) ضرورت سے کم رہ جائے تو اس ہنگامی مشکل کے حل کے لئے بھی حضورؐ نے ایک اصولی راہ نمائی فرمائی ہے۔ ارشاد ہوا:۔

اشعر قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا۔ یا ان کے ہاں کسی حادثہ کی وجہ سے فاقوں کی نوبت آجاتی تو یہ لوگ اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔

حضورؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔ (صحیحین)

اسی قبائلی مسلک کو حضورؐ نے قرآن کریم کی روشنی میں عالم گیر بنا دیا تھا۔

اس حصہ رسدی میں سربراہِ مملکت کی حیثیت کیا ہوتی تھی، اس کا اندازہ عہدِ فاروقی رضؓ کے ایک واقعہ سے لگائیے۔ ایک دفعہ کوفہ کے عامل، عتبہ بن فرقد مرکز میں آئے تو دیکھا کہ حضرت عمرؓ جَو کی روٹی کھا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اب تو مملکت میں گیہوں کا فراط ہوتا ہے۔ آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے۔ اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا وہ اسلام کے معاشی ہی نہیں، سیاسی نظام میں بھی عمودی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

فرقد! عمرؓ کو اس وقت اس کا یقین ہے کہ مملکت میں ہر شخص کو کم از کم جَو کی روٹی میسر آ رہی ہے۔ عمرؓ گیہوں کی روٹی اس دن کھائے گا جب اسے اس کا اطمینان ہو جائے کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔

قرآنِ کریم کی نصِ صریح کے مطابق کوئی شخص اپنی ضرورت سے زائد مال اپنی ملکیت میں رکھ نہیں سکتا۔ (۲/۲۱۹) اس اصول پر کس طریق سے عمل ہو سکتا۔ اس کا اندازہ مسلم کی اس روایت سے لگ سکتا ہے جس میں حضرت ابو سعیدؓ نے کہا۔

> ہم لوگ رسول اللہؐ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس ضرورت سے زائد سواری ہو وہ اس آدمی کو دے دے جسے اس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زائد زادِ راہ ہو وہ اسے دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو۔ اسی طرح آپ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد کسی چیز کے رکھنے کا حق حاصل نہیں۔

یہ اس نظام کے عبوری دَور کی بات تھی جب وہ نظام اپنی مکمل شکل میں نافذ ہو گیا۔ تو اس میں یہ اصول کارفرما تھا کہ ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق وہ کام کرتا — جو اس کے سپرد کر دیا جاتا — اور اس کے اور اس کے بال بچوں کی ضروریات بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت کے سر پر ہوتی۔

قرآنِ کریم کی رو سے، مال و دولت جمع کرنے کی سخت ممانعت ہے۔ اسی ارشادِ خداوندی کی تعمیل تھی جس کی رو سے:۔

> آنحضرتؐ نے نہ درہم چھوڑا نہ دینار۔ نہ بکری نہ اونٹ۔ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی۔ (مسلم)

ذرائع رزق میں زمین کو اولیں حیثیت حاصل ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ مملکت کی تحویل میں رہتی ہے تاکہ اس سے تمام افرادِ مملکت کو رزق مہیا کیا جا سکے۔ حضورؐ کے زمانے میں انتظامی سہولت کی غرض سے زمین کے قطعات خود کاشت کے لئے دیئے جاتے تھے لیکن کسی زمیندار کا زمین کو مزارع کو بٹائی پر دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب یہ نظام عبوری دَور میں تھا تو اس زمانے میں :۔

> (حضرت) رافع بن خدیج نے ایک زمین کاشت پر لی۔ وہ اسے پانی دے رہے تھے کہ حضورؐ کا گذر اُدھر سے ہوا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ زمین کس کی ہے اور کھیتی کس کی۔ رافع نے کہا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا جس کی یہ زمین ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو۔ زمین، صاحبِ زمین کو واپس کر دو اور اپنا خرچہ اس سے وصول کر لو۔ (ابو داؤد)

آپ سوچ لیجئے کہ جس نظام میں بٹائی کو سودی کاروبار قرار دیا گیا ہو اس میں زمین کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ جب عراق کی زمینیں فتح ہوئی ہیں تو حضرت عمرؓ نے ان سب کو مملکت کی تحویل میں دے دیا تھا۔

اور آخر میں حضرت عمرؓ کا وہ قول جس نے اسلام کے معاشی نظام کو یوں سمٹا کر رکھ دیا ہے، جیسے آنکھ کے تل میں آسمان ——— یعنی :۔

> لو مات کلب علی شاطی الفرات جوعًا کان عمرًا مسئولاً عنه یوم القیمة۔
>
> اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو قیامت کے دن عمر سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

ہم نے (جیسا کہ پہلے کہا ہے) اسلام کے معاشی نظام کی ہلکی ہلکی سی جھلکیاں یہاں پیش کی ہیں۔ اگر آپ اسے تفصیل سے دیکھنا چاہیں تو پرویز صاحب کی یگانۂ روزگار تصنیف ——— شاہکارِ رسالتؐ ——— میں معاشی نظام سے متعلق باب کا مطالعہ فرمایئے۔

(بقیہ لمعات بر صفحہ ۵۵)

باسمہٖ تعالیٰ

جبر سے دِل پہ اِختیار کے ساتھ!

جمہُوری حکومت اور اِسلامی نظام میں فرق

پرویز صاحب کا طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ
نومبر ۱۹۷۳ء سے خطاب

جسے، اس کی اہم افادیت کے پیشِ نظر
بعد از نظرِ ثانی، دوبارہ شائع کیا جاتا ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

جبر ہے دِل پہ اختیار کے ساتھ

(قسط اوّل)

حدودُ اللہ کا صحیح مفہوم

علمائے علم الحیات کی تحقیق یہ ہے کہ زندگی اپنے اوّلین جرثومہ سے (جسے قرآنِ کریم نے "نفسِ واحدہ" کہہ کر پکارا ہے) ارتقار کی مختلف منازل طے کرتی، آگے بڑھتی چلی آئی، تا آنکہ اس نے پیکرِ حیوانی اختیار کر لیا، اور وہاں سے ایک قدم آگے بڑھی تو لباسِ آدمیت میں جلوہ پیرا ہو گئی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ: وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیۡرُ بِجَنَاحَیۡهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمۡثَالُكُمۡ ؕ مَا فَرَّطۡنَا فِی الۡكِتٰبِ مِنۡ شَیۡءٍ (۶/۳۸) "زمین پر چلنے والے جاندار ہوں یا فضا میں اڑنے والے پرندے، یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا صحیفۂ فطرت اس قدر جامع و مانع ہے کہ اس میں کسی شئے کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔"

خُدا کا قانونِ تخلیق

ان محققین نے یہ بھی بتایا ہے کہ کاروانِ حیات کا اندازِ سفر یہ رہا ہے کہ یہ ایک مقام پر ٹھہرا۔ وہاں کچھ عرصہ ستایا، اور پھر اپنی اگلی ارتقائی منزل کے لئے رختِ سفر باندھ لیا۔ اس نئے سفر میں، اس نے جو زائد از ضرورت ساز و یراق تھا، اور جس نے اگلے راستے میں محض بوجھ بن جانا تھا، وہیں چھوڑ دیا، اور انہی نقوش و عناصر کو ساتھ لے کر آگے بڑھا جو اس کے ارتقاء میں ممد و معاون ہونے تھے، قرآنِ کریم نے تخلیقی سلسلہ میں، خدا کو جو المصوّر کے ساتھ البارئ کہا ہے۔ (۵۹/۲۴) تو اس کے یہی معنی ہیں۔ یعنی زندگی کو حشو و زوائد سے منزہ کر کے نئی شکل دینے والا۔ قافلۂ زندگی کی انہی منازل کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ: وَهُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسۡتَقَرٌّ وَّمُسۡتَوۡدَعٌ ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّفۡقَهُوۡنَ ۔ (۶/۹۹) و (۱۱/۶) "خالقِ کائنات وہ ہے، جس نے تمہاری تخلیق کا آغاز ایک جرثومۂ حیات سے کیا۔ پھر اس جرثومہ نے اپنی ارتقائی منازل طے کرنا شروع کیں، اس طرح کہ وہ کچھ وقت کے لئے ایک منزل میں ٹھہرا، اور اس منزل نے پھر اسے اگلی منزل کے سپرد کر دیا۔ ہم نے یہ تمام قوانین نکھار کر بیان کر دیئے ہیں لیکن انہی کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں۔" اس سارے سفر میں، کچھ نقوش ایسے بھی تھے جنہیں زندگی مسلسل اور متواتر اپنے ساتھ لئے آگے بڑھتی رہی۔ انہیں، جانداروں کی جبلی فطرت یا (INSTINCTS) کہا جاتا اور اصولی طور پر انہیں تین شقوں میں تقسیم کیا جاتا۔ یعنی جذبۂ تحفظِ خویش (SELF-PRESERVATION) جذبۂ تغلبِ خویش (SELF-AGGRESSION) اور جذبۂ افزائشِ خویش (SELF-REPRODUCTION) یعنی زندگی جہاں بھی ہو گی وہ اپنا تحفظ چاہے گی۔ اس تحفظ کے لئے وہ دوسروں پر غلبہ و تسلط رکھنا چاہے گی۔ اور پھر اپنا

زندگی کے بنیادی تقاضے

تسلسل، اپنی نسل کی صورت میں قائم اور باقی رکھے گی۔ یہ زندگی کے بنیادی تقاضے ہیں جنہیں وہ بہرحال پورا کرنا چاہتی ہے۔ وہ انہیں پورا کرنے کے لئے اپنی انتہائی توانائیاں صرف کر دیتی ہے اور جہاں اس میں شکست کھا جاتی ہے، مٹ جاتی ہے۔ یہ سب خدا کے قانونِ محو و ثبات کے مطابق ہوتا ہے۔ يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ۔ (۱۳/۳۹) اس قانونِ فطرت کے مطابق جس کی اصل و بنیاد علمِ خداوندی میں ہے۔

زندگی کے یہ تقاضے، ہر نوع (SPECIES) کے ہر فرد کے اندر از خود موجود ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ہر نوع اور اس کا ہر فرد اپنا اپنا تحفظ اور تغلب چاہے گا تو مختلف انواع، اور پھر ایک ہی نوع کے مختلف افراد میں باہمی تصادم ناگزیر ہوگا۔ اس باہمی ٹکراؤ سے زندگی کا پاش پاش ہو جانا لازمی تھا۔ لیکن فطرت تو زندگی کو برقرار رکھنا اور آگے بڑھانا چاہتی ہے۔ اس کے لئے اس نے انتظام یہ کیا کہ ان بنیادی جذبات پر اپنا کنٹرول رکھا۔ یہ اسی کنٹرول کا نتیجہ ہے کہ (مثلاً) شیر جیسا مہیب طاقتوں کا مجسمہ اور درندگی کا ہیکل، بھوکوں مر جائے گا لیکن درخت کے پھلوں اور جنگل کی گھاس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ اگر شیر پر فطرت کا یہ کنٹرول نہ ہوتا اور وہ تحفظِ خویش کے لئے گھاس کو بھی اپنے تصرف میں رکھنا چاہتا تو کوئی چرندہ زندہ ہی نہ رہ سکتا۔ سب بھوکوں مر جاتے۔ پھر یہ بھی فطرت کا کنٹرول ہے کہ ہر نوع کی صلاحیتوں کا الگ الگ دائرہ ہے اور اس کی استعداد ایک مقررہ حد۔ اگر شیر سمندر کی گہرائی تک پہنچ سکتا تو کوئی مچھلی (یا بحری جانور) زندہ نہ رہ سکتا، اور اگر بلی کے پَر ہوتے تو کوئی پرندہ باقی نہ بچتا۔ یہ فطرت کے ان تحفظات کا نتیجہ ہے جو اس قدر کثیر التعداد انواع اپنے اپنے دوائر میں زندہ رہتیں اور بقاء الاصلح کے قانون کے مطابق نشو و نما پاتی رہتی ہیں۔

جب زندگی منزلِ آدمیت میں پہنچی تو فطرت کے پروگرام کے مطابق، یہ بھی اپنے بنیادی تقاضوں کو ساتھ لے کر آئی۔ لیکن اس منزل میں زندگی ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہوئی جس سے وہ اس سے پہلے شناسا نہیں تھی۔ یعنی انسان پر سے فطرت نے اپنا کنٹرول اٹھا لیا اور اسے صاحبِ اختیار و ارادہ بنا دیا گیا۔ اسی جہت سے قرآن نے اسے "ایک دوسری مخلوق" سے تعبیر کیا ہے جب کہا کہ: ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۔ (۲۳/۱۴) اور یہی وہ تخلیقی انقلاب تھا جس کا ذکر کرتے ہوئے خدا نے اپنے آپ کو "احسن الخالقین" کہا ہے۔ (۲۳/۱۴)

انسان - صاحبِ اختیار

انسان کے صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کا مفہوم اتنا ہی نہیں تھا کہ فطرت نے اس پر سے کنٹرول اٹھا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ اس کی فطری صلاحیتوں کے امکانات حدود و فراموش اور اس کی استعداد کے دوائر قیود نا آشنا قرار پا گئے۔ اسے قوانینِ فطرت کا علم حاصل کر کے، اُس کی عظیم قوتوں کو مسخر کر لینے کی صلاحیت دی گئی۔ تمام "ملائکہ" آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ اسے آلات، اوزار اور ہتھیار بنانے کی استعداد حاصل ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ زمین پر اس تیزی سے چل سکتا ہے کہ تیز سے تیز رفتار والا جانور اس کی گرد تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ فضا میں اتنی بلندیوں تک اڑ سکتا ہے جو کسی عقاب کے تصور میں بھی نہیں آ سکتیں۔ یہ سمندر کی ان گہرائیوں تک پہنچ سکتا ہے جہاں پانی کی حد ختم ہو جاتی ہے۔

آپ سوچئے کہ اگر کسی نوع کی کیفیت یہ ہو کہ اسے صلاحیتیں ایسی لامحدود اور قوتیں اتنی قیود نا آشنا حاصل ہوں۔ اس کی زندگی کے تقاضے وہی ہوں جو حیوانات کے تقاضے ہیں۔ لیکن اس پر کنٹرول کسی کا نہ ہو، تو اس دنیا کا حشر کیا ہوگا جس میں اس قسم کی مخلوق بستی ہو؟ انسانی زندگی کی یہی ممکنات اور اس کے اختیارات کی یہی وسعتیں تھیں جن کا تصور کرکے، (قصۂ آدم کے تمثیلی بیان کی رو سے، جو درحقیقت آدمی ہی کی داستانِ حیات ہے) ملائکہ نے بحضور رب العزت عرض کیا تھا کہ: اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲/۳۰) کیا تو اب زمین میں ایسی مخلوق پیدا کرنا چاہتا ہے جو وہاں فساد برپا کرے گی اور خون بہائے گی؛ تو خود ہی سوچ لے کہ ایسی مخلوق کے ہاتھوں تیری زمین کا کیا حشر ہوگا جس میں یہ مخلوق بسے گی؟ اس کا جواب ان چار لفظوں میں دیدیا گیا کہ: اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (۲/۳۰) ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔

اس "ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے" کے بعد نگاہ کا رُخ کچھ اس طرف مڑتا ہے کہ خلّاقِ فطرت نے اس نئی مخلوق پر بھی خارجی کنٹرول عائد کر دیا ہوگا۔ لیکن نہیں! یہ خدا کے شایانِ شان نہیں تھا کہ وہ ایک ہاتھ سے انسان کو اس قدر وسیع اختیارات دیتا اور دوسرے ہاتھ سے انہیں سلب کر لیتا۔ اس نے ایسا نہیں کیا۔ چنانچہ قصۂ آدم کے تمثیلی بیان میں، انسان کا تعارف ہی ایک صاحبِ اختیار و ارادہ مخلوق کی حیثیت سے کرایا گیا۔ آدم سے کہا گیا کہ ایسا نہ کرنا۔ اور اس نے اس حکم کی خلاف ورزی کی۔ اس نے خدا کی معصیت کی۔ اس سے سرکشی برتی۔ ظاہر ہے کہ اس سے کائنات مقرنقرا اٹھی ہوگی۔ مظاہرِ فطرت پر کپکپی طاری ہوگئی ہوگی کیونکہ انہوں نے روزِ اوّل سے اس وقت تک اس قسم کا "حادثہ" کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ کوئی فرمانِ خداوندی کی خلاف ورزی کرے۔ اس سے سرکشی برتے! اس سے عالمِ لاہوت میں تہلکہ مچ گیا ہوگا۔ شبستانِ ازل میں حشر برپا ہو گیا ہوگا۔ یہی وہ تحیر انگیز اور محشر خیز منظر تھا جس کی عکاسی اقبالؒ نے ان الفاظ میں کی ہے کہ انسان وجود میں آیا تو ؎

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد — حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ دیگرے — خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

آدم اپنے اختیارات کے بے محابا استعمال سے، کرنے کو تو ایسا کر گیا لیکن بعد میں جب جذبات میں اعتدال پیدا ہوا تو، اس قانون شکنی کے عواقب کے تصور سے گھبرایا، اور ندامت کے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز سے کہا کہ بارِ الٰہا! کیا ابنِ آدم اس طرح اپنے ہاتھوں آپ تباہ ہو جائے گا، یا اس کے لئے ان تباہیوں سے بچنے کی کوئی صورت بھی ہے؟ جواب ملا کہ آدم! ان تباہیوں سے بچنے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ ابنِ آدم سے اختیار و ارادہ کی قوت چھین لی جاتی اور اسے بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور و مقہور بنا دیا جاتا۔ لیکن ہم ایسا نہیں کرنا چاہتے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ ہم ایسی حدود متعین کر دیں جن کے اندر رہتے ہوئے اگر یہ اپنی قوتوں کا استعمال کرے تو اس کا نتیجہ تخریب کے بجائے تعمیر ہو۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (۲/۳۸) اس سے اس کا اختیار و ارادہ بھی باقی رہے گا کہ جو پابندی کوئی اپنے اوپر آپ عائد کرلے اس سے اس کا اختیار چھن نہیں جاتا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ہم نے، ایسے لامنتہی اقتدارات

کا مالک ہوتے ہوئے اپنے اوپر کچھ پابندیاں آپ عائد کر رکھی ہیں۔ اس سے ہمارے قادرِ مطلق ہونے پر کوئی حرف نہیں آگیا۔ ہم جب کہتے ہیں کہ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ۔ (۳۰/۶) یہ ہمارا وعدہ ہے اور ہم اپنے وعدہ کے خلاف کبھی نہیں کریں گے۔ تو یہ کتنی بڑی پابندی ہے؛ جو ہم نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہے۔ لیکن اس سے ہمارے مطلق اختیارات میں کوئی کمی نہیں آگئی۔ لہٰذا، اگر انسان ہماری متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے اختیارات کا استعمال کرے گا تو اس سے اس کے ——— صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کی نفی نہیں ہو جائے گی، اور نتیجہ اس کا تباہی اور بربادی کے بجائے تعمیر و تحسین ہوگا۔ اس کی اپنی ذات کی بھی تعمیر و تحسین اور عالمِ انسانیت کی بھی تعمیر و تحسین۔ بلکہ اگر وہ بہ نگاہِ تعمق دیکھے گا تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آجائے گی کہ اس قسم کی (خود عائد کردہ) پابندیوں سے، انسانی اختیارات کی وسعتیں اور بڑھ جاتی ہیں۔ نہر کی ٹھوکر (FALL) پانی کے بہاؤ کو روکنے کا باعث نہیں، بلکہ اس کی رفتار میں اور تیزی پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہے۔ بم کی قوت کا راز اس خول کی سختی میں ہوتا ہے جس کے اندر بارود مقید ہو۔ ہماری متعین کردہ حدود کی پابندیوں سے بھی انسانی اختیارات کی وسعتیں اور اس کی ذات کی قوتیں بڑھ جائیں گی۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔ (۲/۲۸۶) ہم یہ پابندیاں متعین ہی اس لئے کرتے ہیں کہ انسانی ذات کی صلاحیتوں میں وسعت پیدا ہو۔

یہ حدود وحی کی رو سے متعین کی گئیں اور اب اپنی اصلی شکل میں خدا کی آخری کتاب قرآنِ مجید میں محفوظ ہیں۔ نوعِ انسان کی ساری تاریخ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ انسان نے جب بھی ان حدود سے اعراض برت کر اپنے جبلی تقاضوں کی تسکین چاہی، اس کا نتیجہ یسفک فی الارض و یسفک الدما۔ عالمگیر فساد انگیزیوں اور ہولناک خوں ریزیوں کے سوا کچھ نہ ہوا۔ اور اس نے جب بھی اپنے اختیارات کا استعمال ——— ان حدود کے اندر رہتے ہوئے کیا۔ زندگی مسکرا اٹھی اور گیسوئے کائنات تابدار سے تابدار تر ہوتے چلے گئے۔ حدود کی پابندی کے بغیر کوئی کھیل بھی کھیلا جائے اس کا نتیجہ فساد ہوتا ہے۔ اگر ہاکی یا فٹ بال کے میدان کی لکیریں مٹا دی جائیں یا کھلاڑیوں کو کھلی چھٹی دے دی جائے، تو کھیل کا میدان، میدانِ جنگ بن جائے گا۔

اب آپ وحی کی مقرر کردہ حدود کو چھوڑ کر، انسانی دنیا کی طرف آیئے۔ اس مقصد کے لئے کہ انسانوں کے جبلی تقاضے اس طرح پورے ہوں کہ کوئی فرد اپنی حدود سے آگے بڑھ کر دوسروں کے حقوق کو پامال نہ کرے، انسانوں نے حکومت کے ادارہ (INSTITUTION) کی طرح ڈالی۔ مقصد تو اس سے یہ تھا کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے حقوق کو غصب نہ کر سکے، لیکن نتیجہ اس کا اس کے برعکس برآمد ہوا۔ حدود کا تعین اور ان کا نفاذ جن افراد کے سپرد ہوا، وہ خود حدود فراموش ہو گئے۔ ان میں تحفظِ خویش اور تغلبِ خویش کے جذبہ نے ہوسِ اقتدار کی شکل اختیار کر لی۔ جذبۂ تحفظِ خویش اگر اپنی حد کے اندر رہے تو انسان کو جس وقت اطمینان ہو جائے کہ وہ خطرات سے محفوظ ہے، اس سے اسے تسکین ہو جاتی ہے، لیکن اگر وہ ہر وقت خطرہ

محسوس کرتا رہے تو اس سے اس کا ذہنی اور اعصابی توازن بگڑ جاتا ہے۔ وہ دوسرے انسانوں سے خوف کھانے لگ جاتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اسے ان سے خطرہ ہے۔ اس کے لئے وہ انہیں زیادہ سے زیادہ دبا کر رکھنا چاہتا ہے۔

حکومت کا نظام

یوں اس کا جذبۂ تغلبِ خویش شدید تر ہو جاتا ہے، اور اسی نسبت سے اس کا ذہنی سکون چھنتا اور توازن بگڑتا چلا جاتا ہے۔ یہ جو آپ تاریخ میں بڑے جابر اور مستند حکمرانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ پاگلوں کی سی حرکتیں کیا کرتے تھے، تو سطحی نگاہ سے اس کی توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن ماہرینِ علم النفس (PSYCHOLOGISTS) مدت العمر کی تحقیق اور تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان جبلّی تقاضوں کی تسکین کو جب بھی حدود سے آگے بڑھا دیا جائے اس سے ذہنی اور اعصابی توازن بگڑ جاتا ہے جو رفتہ رفتہ پاگل پن تک پہنچ جاتا ہے۔ ہوسِ زر (GREEDINESS) یا ہوسِ شہرت و اقتدار (AMBITION) بُری عادتیں نہیں بلکہ نفسیاتی امراض ہیں اور دیوانگی (INSANITY) کی علامات۔ قرآن کریم نے نظامِ سرمایہ داری میں ہوسِ زر کے مریضوں کے متعلق کہا ہے کہ ان کی حالت ایسی ہو جاتی ہے۔ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ۔ (۲/۲۷۵) جیسے انہیں سانپ نے ڈس لیا ہو، اور ہوسِ تغلب میں مبتلا اربابِ اقتدار کے متعلق بتایا ہے کہ: إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً۔ (۲۷/۳۴) وہ جس بستی میں داخل ہوتے ہیں، اسے تہس نہس کر دیتے ہیں اور وہاں کے ہر صاحبِ عزت کو ذلیل کرنے میں لذت لیتے ہیں۔

پاگل حکمران

تو یہ اسی ذہنی اور اعصابی عدمِ توازن کا پیدا کردہ پاگل پن ہوتا ہے۔ اس بیماری میں ہوتا یہ ہے کہ اس آگ کو جس قدر بجھانے کی کوشش کی جائے یہ اتنی ہی اور بھڑکتی چلی جاتی ہے۔ أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔ (۱۰۲/۱-۲) حتیٰ کہ انسان قبر کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔ (جذبۂ افزائشِ نسل کا ذکر ہم بعد میں کریں گے جس کی حدود فراموش تسکین کو زنا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح پاگل پن کی علامت ہوتا ہے۔) ان حالات میں، تحفظِ خویش یا تغلبِ خویش کے تقاضوں کی تسکین، مقصود بالذات نہیں رہتی بلکہ دوسروں کو مغلوب رکھنے اور انہیں اذیت پہنچانے سے لذت حاصل ہونے لگ جاتی ہے۔ سائیکلوجی کی اصطلاح میں اسے (SADISTIC TENDENCY) کہا جاتا ہے۔ جس طرح خارج (کھجلی) میں یہ ہوتا ہے کہ جوں جوں کھجاتے جائیے اس کی لذت، کھجانے کی خواہش کو تیز تر کرتی چلی جاتی ہے، (SADISM) یعنی دوسروں کو اذیت پہنچا کر لذت حاصل کرنے کے مریض کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ چونکہ اس میں کسی مقام پر جا کر بھی تسکین حاصل نہیں ہوتی اس لئے ایسا مریض ہر وقت غیر مطمئن اور دوسروں کے باعزت ہو جانے سے خائف رہتا ہے اور اس

اذیت رسانی کا مریض

اذیت رسانی میں اور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس طرف یہ ہوتا ہے اور دوسری طرف ان لوگوں کی طرف سے جنہیں وہ مغلوب رکھنا چاہتے ہیں، اس استبداد کے خلاف ردِّ عمل شروع ہو جاتا ہے۔ تاریخِ انسانیت اس حقیقت کی شاہد ہے کہ مستبد حکمران، دوسروں کو مغلوب تو کر سکتے ہیں، لیکن اس استبداد اور استحصال کے خلاف انکے

دل سے جو ردِ عمل اُبھرتا ہے، اسے روک نہیں سکتے۔ اس لئے تحفظِ خویش کا جذبہ تو ان کے اندر بھی اس طرح فطری ہوتا ہے، اور جب وہ اسے پورا ہوتے نہیں دیکھتے تو اس کے خلاف ردِ عمل لازمی ہوتا ہے، اس ردِ عمل کا نتیجہ، سرکشی ہوتا ہے۔ ان کی اس سرکشی سے، مستبد حکمرانوں کا جذبۂ انتقام اور ابھرتا ہے۔ ان کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کے مدِمقابل صاحبِ اختیار و ارادہ انسان نہ رہیں، مجبور مشینیں (WILL-LESS INSTRUMENTS) بن جائیں جو ان کے اشاروں پر چلتی رہیں۔ قرآن کریم نے استبدادِ فرعون کی اس ٹیکنیک کو يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَهُمْ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ قوم کے اُن افراد کو جن میں جوہرِ مردانگی کی نمود ہوتی، کچل کر رکھ دیتا، اور ان افراد کو آگے بڑھاتا جو اس جوہر سے عاری ہوتے۔ جب معاشرہ میں حکمران طبقہ کا استبداد عام ہو جائے تو اس سے معاشرہ، عجیب قسم کے تباہ کن دائرۃ السوء (VICIOUS CIRCLE) میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ حاکم اور محکوم دونوں ایک دوسرے کی طرف سے خائف رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ عدمِ اعتماد ہوتا ہے اور عدمِ اعتماد کا نتیجہ فساد اور تخریب۔ فساد اور تخریب سے جنون کی تو کسی حد تک تسکین ہو جاتی ہے لیکن فطری تقاضوں کی نہیں۔ فطری تقاضوں کی تسکین، متوازن زندگی ہی میں ممکن ہوتی ہے۔ غیر متوازن میں نہیں، خواہ یہ عدمِ توازن، جذبات کے بیباک اور حدود فراموش ہو جانے سے پیدا ہو اور خواہ ان کے دبائے جانے سے۔ اس عدمِ توازن کو علم النفس میں بد نہادی (PERVERSION) سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن عصرِ حاضر کے، علمِ تحلیلِ نفسی کے ایک ممتاز ماہر (ERICH FROMM) نے اس کے لئے ایک نہایت خوبصورت اصطلاح وضع کی ہے۔ وہ اسے (UN-LIVED LIFE) کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (MAN FOR HIMSELF) میں لکھتا ہے:-

> زندگی کا تقاضا زندہ رہنا اور بڑھنا، پھولنا، پھلنا ہے۔ اگر اس کے اس تقاضا کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہو جائے تو اس مسدود توانائی میں ایک تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اور وہ زندگی کو نشوونما دینے کے بجائے، اسے تباہ کر دینے کا موجب بن جاتی ہے۔ یاد رکھئے، تخریب یا تباہی، (UN-LIVED LIFE) کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ افراد یا معاشرتی حالات جو زندگی کی نشوونما کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں، تخریب پیدا کرتے ہیں۔ اور تخریب وہ سرچشمہ ہے جس سے شر کے مختلف مظاہر پھوٹتے ہیں۔ (ص ۲۱۸)

میں نے (UN-LIVED LIFE) کی اصطلاح کا ترجمہ نہیں کیا۔ مجھے اس کے ترجمہ کے لئے، اطمینان بخش الفاظ مل نہیں سکے۔ قرآن کریم اس قسم کی کش مکش اور تخریب کو جہنم کی زندگی کہہ کر پکارتا ہے، اور اس کے متعلق کہتا ہے کہ: لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ۔ (۲۰/۷۴ ؛ ۸۷/۱۳) اس میں نہ موت ہو گی، نہ زندگی۔ یہ ہے (UN-LIVED LIFE)۔ یہ درحقیقت، زندگی کے اندرونی تقاضوں اور خارجی موانعات کی باہمی کش مکش کا نام ہے۔ یہ کش مکش، مستبد فرماں روا اور مقہور و مغلوب فرماں پذیر، دونوں کے

سینوں کو وقفِ اضطراب رکھتی ہے۔ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ ۔ (۱۰۴/۶-۷) وہ آگ جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ دورِ جہالت کا جابر حکمران، اپنے استبداد کو مصلحت کوشیوں کے پردوں میں چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا اس لئے وہ اعلانیہ کہتا تھا کہ، اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی ۔ (۷۹/۲۴) میں تمہارا حاکمِ مطلق ہوں۔ لیکن عصرِ حاضر کا حکمران، جس میں تہذیب و تمدّن کا شہرہ اور آزادی کا تصوّر عام ہو گیا ہے، اس حقیقت کو مختلف اصطلاحوں کے نقاب میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی وہ اپنے اس جنون کو ...... (REVOLUTION) "انقلاب" کہہ کر پکارتا ہے۔ حالانکہ یہ انقلاب نہیں بلکہ سرکشی (REBELLION) یعنی حدود فراموشی ہوتی ہے۔ انقلاب کا سرچشمہ قلب ہوتا ہے، یعنی دلوں کی تبدیلی، اور (REBELLION) سرسام کا دوسرا نام ہے۔ اور کبھی وہ اسے مفادِ عامہ کی خاطر سلب و نہب سے تعبیر کرتا ہے۔ اپنے استبداد کو اس قسم کی فریب انگیز اصطلاحوں کے نقاب میں چھپانے کی کوشش درحقیقت اس آگ کا دھواں ہوتی ہے جو اس کے سینے کی بھٹی میں بھڑک رہی ہوتی ہے اور جو اسے کسی پہلو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ اس کی تلوّن مزاجی۔ اس کی وعدہ فراموشیاں۔ اس کی تضاد بیانیاں؛ اس کی مجنونانہ حرکتیں سب اس کی اندرونی تڑپ و خلش کے مظاہر ہوتے ہیں۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ انسانوں نے حکومت کا تصوّر اس لئے پیدا کیا تھا کہ افراد کے جبلّی تقاضوں کی تسکین کے لئے حدود عائد کی جا سکیں، لیکن یہ اس کی حرماں نصیبی اور شوریدہ بختی ہے کہ یہ (تنہا عقل کی رُو سے) کوئی ایسا نظامِ حکومت آج تک وضع نہیں کر سکا جو اس مقصد کو پورا کر سکے۔ اس مقصد کو پورا کرنا تو ایک طرف، اس کا وضع کردہ ہر نظام، تعمیر کے بجائے تخریب کا موجب بنتا رہا۔ اس کی ان ناکام کوششوں کی آخری کڑی، نظامِ جمہوریت ہے، جس کا ڈھنڈورا یہ کہہ کر پیٹا جاتا ہے کہ یہ وہ فردوس ہے جسے ابنِ آدم نے کھو دیا تھا اور، صدیوں کی صحرا نوردیوں اور دشت پیمائیوں کے بعد، اب اس نے اسے دوبارہ پا لیا ہے۔ لیکن ابھی یہ نظام چار قدم بھی چلنے نہیں پایا کہ خود اقوامِ مغرب کے مفکرین اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو رہے ہیں کہ یہ نظام بے حد ناکام رہا ہے۔ شخصی نظامِ حکومت کو اس لئے مردود قرار دیا جاتا تھا کہ اس میں حکمران کے ارادے اور مرضی کو اقتدارِ مطلق حاصل ہوتا تھا۔ یعنی اس پر کوئی حدود عائد نہیں ہوتی تھیں۔ یہی بنیادی نقص نظامِ جمہوریت میں بھی موجود ہے۔ یعنی اس میں بھی برسرِ اقتدار پارٹی کے ارادوں کو اقتدارِ

نظامِ جمہوریت کی ناکامی

مطلق حاصل ہوتا ہے۔ اس پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ سیاسی اصطلاح میں اسے (SOVEREIGNTY) حاصل ہوتی ہے۔ اس اصل کے اعتبار سے شخصی نظام اور جمہوری نظام میں کوئی فرق نہیں۔

فرانسیسی مفکر (BERTRAND - DE - JOVENEL) اپنی معروف تصنیف میں، جس کا نام ہی (SOVEREIGNTY) ہے، لکھتا ہے کہ:-

بہ ادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر ایک دفعہ آپ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ انسانی مرضی و ارادے کو اقتدارِ مطلق حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد جو نظامِ حکومت بھی قائم ہوں گے، حقیقت

کے اعتبار سے وہ سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظامِ ملوکیت، اور نظامِ جمہوریت بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں، لیکن اس اصول کی رو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو، یہ اصول اسے یکساں حق مطلق العنانی عطا کر دیتا ہے۔ (ص ۹۹)

یعنی اس اصول کی رو سے، شخصی نظام اور جمہوری نظام یکساں ہیں۔ اور جمہوری نظام اس لحاظ سے، اس سے بدتر ہے کہ شخصی نظام میں ایک پاگل سے واسطہ پڑتا ہے۔ جمہوری نظام میں سو "پاگل" اکٹھے ہو جاتے ہیں (پاگل سے کیا مراد ہے۔ اس کے متعلق میں پہلے عرض کر چکا ہوں)۔ کہا جائے گا کہ شخصی نظام اور جمہوری نظام میں اس قسم کی مماثلت مغالطہ آفرین ہے۔ جمہوری نظام میں، برسرِ اقتدار پارٹی، اپنے اختیارات پر پابندیاں عائد کرتی ہے[1]۔ ان کا اقتدار، بلاحدود نہیں ہوتا۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن ذرا سوچئے کہ جس پارٹی کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ جس قسم کی جی چاہے پابندیاں وضع کرے۔ جب جی چاہے ان میں ردّ و بدل کر دے اور جس وقت جی چاہے انہیں توڑ کر پھینک دے، کیا اس کے اختیارات کو محدود اور مقید قرار دیا جائے گا؟ یہ پابندیاں لگتی کب اور کس طرح ہیں، اسے تو کوئی دیدہ ور ہی جان سکتا ہے۔ لیکن کانچ کی ان چوڑیوں کے ٹوٹنے کی کڑکڑاہٹ روز سنائی دیتی ہے۔

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی نشوونما اور برومندی کیلئے ضروری ہے کہ اس کے جبلّی تقاضوں کی تسکین پر پابندیاں عائد ہوں۔ یعنی ایسی حدود جن کے اندر رہتے ہوئے ہر فرد اپنے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اور بات یہاں تک پہنچی کہ فکرِ انسانی آج تک کوئی ایسا نظام نہیں وضع کر سکا جس میں یہ بنیادی مقصد حاصل ہو سکے۔ اس نے جو نظام بھی وضع کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ لوگ یکسر حدود فراموش ہو گئے، اور اکثریت کا اس طرح گلا دبا دیا گیا جس سے ان کے یہ تقاضے پورے ہی نہ ہو سکیں۔ یہ انسان کی انتہائی ناکامی ہے اور اس کا نتیجہ مسلسل جہنم۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی تمدنی زندگی کا سب سے اہم اور مشکل ترین مسئلہ (PROBLEM) ہی یہ ہے کہ اس کے جبلّی تقاضوں (جذبات) پر کس قسم کی پابندیاں عائد کی جائیں۔ ان پابندیوں کے عائد کرنے کا حق کسے حاصل ہے۔ اور انسان ان کی نگہداشت کس طرح کر سکتا ہے۔ انسانی فکر اس اہم ترین مسئلہ کے حل کی تلاش میں سرگرداں چلا آ رہا ہے۔

قرآن نے کہا کہ ایسا فرض کرنا ہی غلط ہے کہ انسانی فکر اس قسم کا نظام وضع کر سکتا ہے جس میں تمام افرادِ انسانیہ کے یہ تقاضے، اس طرح پورے ہوتے چلے جائیں کہ نہ کوئی سرکش ہونے پائے اور نہ ہی مقہور۔ نہ کوئی حدود فراموشی کے سرسام کی وجہ سے پاگل ہو جائے، اور نہ ہی ایسے آہنی شکنجوں میں مقبوض کہ اس کا دم ہی گھٹ جائے۔ اس نے کہا کہ اس قسم کا نظام خدا کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ وہ جو اس نے کہا ہے کہ ..... اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) تو اس سے یہی مراد ہے۔ اور جو اس نے اپنے ضابطہ ہدایت کو "حدود اللہ"

---

[1] یہ پابندیاں آئین کی رو سے عائد ہوتی ہیں لیکن آئین خود انہی کا وضع کردہ ہوتا ہے اور یہ جب چاہے اس میں ترمیم و تنسیخ بھی کر سکتے ہیں۔

کہہ کر پکارا ہے تو اس سے یہی مفہوم ہے۔ یعنی اس نے واضح طور پر کہا ہے کہ حلال اور حرام مقرر کرنے کی اتھارٹی صرف خدا کو حاصل ہے۔ (۵۹/۱) اور کسی کو نہیں۔ حتیٰ کہ اپنی ذاتی حیثیت سے رسول کو بھی نہیں (۶۶/۱)۔ فقہ میں تو اسے "شرعی حلال اور کڑا حرام" کے مسائل تک محدود کر لیا گیا لیکن اگر اس کی وسعت پر غور کیا جائے تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ انسانی آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرنے کی اتھارٹی صرف خدا کو حاصل ہے۔ قائداعظمؒ کے ناقابلِ فراموش الفاظ میں "قرآن وہ ضابطۂ ہدایت ہے جو ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتا ہے"۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے روسی مفکر (DOSTOEVSKI) نے ان چار الفاظ میں نہایت جامعیت سے بیان کر دیا ہے:۔

(IF THERE IS NO GOD EVERYTHING IS POSSIBLE)

یعنی خدا سے انکار کر دیا جائے تو کوئی پابندی باقی نہیں رہتی۔ سب حدود مٹ جاتی ہیں۔ (سب کچھ "حلال" ہو جاتا ہے)۔ اور اس کا نتیجہ فوضویت (انارکی) کے سوا کچھ نہیں ہوتا جسے قرآن، فساد کہہ کر پکارتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ (قرآن) اقتدارِ مطلق کسی انسان کو نہیں دیتا۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ: لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (۲۱/۲۳) یہ حیثیت صرف خدا کو حاصل ہے کہ وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں۔ (HE IS ACCOUNTABLE TO NONE)۔ انسانوں میں کسی کی یہ حیثیت نہیں۔ جو لوگ اس صداقت کو تسلیم کر لیں، وہ انہیں مومن کہہ کر پکارتا اور ان کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ: اَلْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ۔ (۹/۱۱۲) حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے۔ یہ حدود قرآن کے اندر منضبط ہیں۔ (۹/۴) لہٰذا، اسلامی مملکت وہ ہے جو اپنا تمام کاروبار حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دے۔

آئینِ پاکستان

میری عزیز بہنو اور بھائیو! پہلے دن سے یہی پکار تھی کہ اگر آپ کا یہ دعویٰ ہے کہ پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کیلئے حاصل کیا گیا ہے، تو مملکت کو اس کا اعلان کرنا چاہیئے کہ وہ اپنا تمام کاروبار حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دیگی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں میری نوا گری کا کس حد تک دخل تھا لیکن یہ الفاظ "قرارداد مقاصد" میں داخل کر دیئے گئے؛ اور اس کے بعد ہر آئینِ پاکستان میں دہرائے جا رہے ہیں۔ چنانچہ حالیہ آئین (۱۹۷۳ء) کے ابتدائیہ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:۔

جملہ کائنات پر اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہے، اور وہ اختیار جسے اہلِ پاکستان خدا کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے، استعمال کریں گے، ایک مقدس امانت ہے۔

اس کے علاوہ، اس آئین میں اسلام سے متعلق دو اور شقیں بھی ہیں۔ آئین کے تعارف (آرٹیکل ۲) میں کہا گیا ہے کہ:۔

پاکستان کا مملکتی مذہب، اسلام ہوگا۔

اور آئین کی دفعہ ۲۲۷ میں کہا گیا ہے کہ:۔

جملہ رائج الوقت قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق مرتب کیا جائے گا جو قرآنِ پاک اور سنت میں

---

(۱) یہ خطاب ۱۹۷۳ء کا نوشتہ ہے۔

مندرج ہیں۔ اور آئندہ کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو ان احکام سے متصادم ہو۔

جہاں تک اس شق کا تعلق ہے کہ پاکستان کا مملکتی مذہب، یا مملکتِ پاکستان کا مذہب اسلام ہوگا، ہم واضعین و ناقدینِ آئین، اور اربابِ شریعت، دونوں سے بار بار دریافت کر چکے ہیں کہ وہ ان الفاظ کا مفہوم واضح کریں۔ لیکن کسی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ مذہب انسانوں کا ہوتا ہے، کسی ادارہ کا نہیں۔ اور سٹیٹ تو درحقیقت کوئی ادارہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ ایک سیاسی تصور یا نظریہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ مغرب کے موجودہ نظریۂ سیاست نے جب خدا کو اپنی حدود سے نکال باہر کیا تو انہیں کسی اور معبود کی تلاش ہوئی جو اس کی جگہ لے سکے۔ اس مقصد کے لئے سٹیٹ کا بت تراشا گیا۔ اسے پہلے، ایک (PERSONALITY) عطا کی گئی اور اس کے بعد اسے معبود قرار دے دیا گیا۔ اب اقوامِ مغرب کے ہاں اس معبود کی پرستش ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے "مملکت کے مذہب" کا تصور پیش کیا ہے، ان کے تحت الشعور میں، مغرب کا یہی نظریہ ہے۔ اقوامِ مغرب کے جمہوری نظام میں اس معبود کو سٹیٹ کہا جاتا ہے اور اشتراکی ممالک میں (PEOPLE) یا عوام، جنہیں خدا کے بجائے اقتدارِ اعلیٰ کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔ قرآن، مملکت کے اس مغربی تصور کو باطل قرار دیتا ہے اس لئے اس نے اپنے ہاں "مملکت" کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ اس نے "خطۂ زمین" میں "حکومت" کا ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ وہ حکومت کس قسم کی ہونی چاہیئے۔

جہاں تک اس شق کا تعلق ہے کہ مملکت میں کوئی قانون "کتاب و سنت" کے خلاف نہیں ہوگا، ہمارے اربابِ شریعت اس امر کا اعتراف و اعلان کر چکے ہیں کہ "کتاب و سنت" کی رو سے کوئی ضابطۂ قوانین ایسا مرتب نہیں کیا جا سکتا ہے جسے مسلمانانِ پاکستان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر سکیں۔ مودودی صاحب نے یہ اعتراف، واضح الفاظ میں کیا ہے اور اربابِ شریعت میں سے کسی نے نہ اس کی تردید کی ہے اور نہ ہی اس کا دعویٰ ہے کہ وہ ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کر سکتے ہیں۔

یہ دو شقیں تو یوں ختم ہو گئیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ قرآنِ کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں جن کی تلاوت تو کی جاتی ہے، لیکن ان کا حکم منسوخ ہے۔ (بلاتشبیہ) ہمارے آئین کی ان شقوں کی حیثیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ اور اسے یہ سب جانتے ہیں۔

اب رہی تیسری شق کہ اہلِ پاکستان، اپنے اختیارات کو خدا کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کریں گے تو یہ شرط دین کی اصل و بنیاد، قرآن کا عروۃ الوثقیٰ، اور اسلامی نظام کا مرکزِ ثقل ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آئین میں کہیں اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ وہ حدود کونسی ہیں، کس جگہ ملیں گی، اور ان پر عمل کی شکل کیا ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس صراحت اور وضاحت کے بغیر، اس شق کا مقصد بھی "حصولِ ثواب" سے زیادہ کچھ نہیں رہتا۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ خدا کی مقرر کردہ یہ حدود، اس کی کتاب، قرآنِ مجید کے اندر موجود و محفوظ ہیں اور مقصد ان سے یہ ہے کہ انسان اپنے جبلّی تقاضوں کی تسکین۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے کرے۔ قرآنِ کریم میں

کچھ متعین احکام ہیں جنہیں اوامر و نواہی، یا معروف و منکر، سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور باقی وہ اقدار ہیں جنہیں اصولی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ یہ احکام، اقدار و اصول، سب خدا کی مقرر کردہ حدود ہیں۔ جو غیر متبدل ہیں۔ میرے لئے یہ تو مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے کہ میں ان تمام حدود کو ایک خطاب میں سمٹا سکوں۔ ان میں سے چند ایک آپ کے سامنے پیش کر سکوں گا۔ ان سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ ان حدود کا مفہوم کیا ہے۔ یہ عمل میں کیسے لائی جا سکتی ہیں، اور انسان اگر اپنے اختیار و ارادہ کو ان کے اندر محصور کر لے تو یہ دنیا کیا سے کیا بن جائے۔ انہیں غور سے سنئے گا۔

حدود اللہ

اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے، یہ سوال بار بار مرکوزِ توجہ رہا کہ اس سلسلہ زریں کا آغاز کس کڑی سے کیا جائے کہ ان میں سے ہر کڑی اپنی اپنی جگہ یکساں اہمیت کی حامل ہے۔ کافی غور و فکر کے بعد، فٹ بال کے کھیل کے میدان کی مثال سے ایک حقیقت زیادہ نمایاں طور پر میرے سامنے آگئی۔ اور وہ یہ کہ میدان کے چاروں طرف ایک حد ہوتی ہے جسے (BOUNDRY LINE) کہا جاتا ہے۔ اہمیت کے لحاظ سے تو ہر حد یکساں ہوتی ہے لیکن باقی حدود، اس حدالحدود کے اندر ہوتی ہیں۔ چنانچہ میں اس سلسلہ کا آغاز، اسی حدالحدود سے کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ (میری بصیرت کے مطابق) قرآن کی رو سے بھی اس حد کی یہی پوزیشن سمجھ میں آتی ہے۔ اور وہ حدالحدود ہے احترامِ آدمیت۔ تکریمِ انسانیت۔ آپ بنظرِ تعمق دیکھیں گے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآنی تعلیم کا مطلوب و مقصود، یہی حد ہے۔ باقی حدود، اسی حد پر متفرع ہیں، اور اسے محفوظ رکھنے کا ذریعہ۔ علامہ اقبالؒ نے جب کہا تھا کہ:

احترامِ آدمیت

برتر از گردوں مقامِ آدم است — اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

تو "اصلِ تہذیب" سے ان کا بھی یہی مطلب تھا۔ قرآنِ کریم نے اس حد کو ان چار لفظوں میں بیان کر دیا ہے جب کہا کہ:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ - (۱۷/۷۰)

ہم نے ہر انسان، ہر ابنِ آدم، کو محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم بنایا ہے۔ آپ ان چار لفظوں کے اندر مستور حقائق کو کھولتے جائیے اور دیکھئے کہ یہ کس طرح ہر چہار اطرافِ عالم کو محیط ہوتے چلے جاتے اور ساری فضائے کائنات کو اپنے آغوش میں لے لیتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

ضروری اعلان

(۱) جواب طلب امور کے لئے جوابی خط بھیجئے ورنہ تعمیل نہیں ہوگی۔
(۲) ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک پرچہ نہ ملنے کی شکایت پر پرچہ بلا قیمت بھیجا جائے گا۔
(۳) خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

(ناظمِ ادارہ)

خُدا اور قیصر

۱۹۵۵ء میں طلوعِ اسلام ہفتہ وار شائع ہوتا تھا تو یہ مقالہ اس کی اشاعت بابت ۴ر جون ۱۹۵۵ء میں بطور اداریہ شائع ہوا تھا۔ اس کی افادیت کے پیشِ نظر قارئین کے تقاضا پر اسے ماہنامہ طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۵۹ء میں دوبارہ شائع کیا گیا۔ اب جبکہ اسلامی مملکت یا اسلامی نظام کا سوال زیادہ ابھر کر سامنے آرہا ہے تو اکثر احباب نے تجویز کیا ہے کہ اس مقالہ کو بار دگر شائع کیا جائے۔ ہم اس سے متفق ہیں۔ اسلامی مملکت کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ غیر اسلامی معاشرہ اور نظامِ حکومت میں جن امور کو "مذہبی" قرار دے کر انہیں مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں دے دیا جاتا ہے وہ بھی خود حکومت کے دائرہ کار میں شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح امورِ مملکت اور امورِ شریعت کی ثنویت ختم ہو جاتی ہے اور مذہبی پیشوائیت کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اس مقالہ میں اسی نکتہ کی وضاحت کی گئی ہے۔ امید ہے اس کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے گا۔ دورانِ مطالعہ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیئے کہ یہ مقالہ ۱۹۵۵ء میں لکھا گیا تھا۔

اس کے بعد مساجد کے متعلق دوسرا مقالہ ملاحظہ فرمایئے۔ وہ بھی جولائی ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔

(۱)

خدا اور قیصر

رمضان المبارک کی انتیسویں تاریخ ہے۔ مطلع ابر آلود ہے۔ افطار کے بعد ہر شخص کی آنکھیں ایک خاص سمت کو اٹھ رہی ہیں کہ دیکھیں وہاں سے کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ کل عید ہوگی یا ایک اور روزہ رکھنا ہوگا۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ تذبذب کی وجہ سے سینوں میں دل دھڑک رہے ہیں۔ دوکاندار دکانوں پر سودے نہیں لگاتے کہ معلوم کل کے متعلق کیا فیصلہ ہو۔ خریدار چیزیں نہیں خریدتے کہ پہلے کچھ فیصلہ ہو جائے تو پھر خریداری کی جائے۔ غرضیکہ

مملکت کا گورنر جنرل بھی انتظار میں ہے۔

وزیرِ اعظم بھی انتظار میں ہے۔

کابینہ کے وزراء بھی انتظار میں ہیں۔
قوانین ساز حضرات بھی انتظار میں ہیں۔
عدالتوں کے جج انتظار میں ہیں۔
فیڈرل کورٹ کا چیف جسٹس بھی انتظار میں ہے۔
پولیس کا انسپکٹر جنرل انتظار میں ہے۔
فوج کا کمانڈر انچیف انتظار میں ہے۔

یہ سب انتظار میں ہیں کسی کے فیصلے کے! یقیناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب کس کے فیصلہ کے انتظار میں ہیں۔ وہ کون سا مرکز ہے جس کی طرف مملکت کے کروڑوں انسانوں کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ وہ کون سی اتھارٹی ہے جس کے پیش نظر یہ تمام ارباب اقتدار و اختیار دم بخود بیٹھے وقفِ انتظار ہیں اور کوئی جرأتِ لب کشائی نہیں کرتا؟

یہ کروڑوں نگاہوں کا مرکز، یہ اتھارٹی اور اقتدار کا سب سے بڑا سرچشمہ، کراچی کی ایک مسجد ہے جس میں دو تین مولوی صاحبان بڑے عز و تمکنت سے بیٹھے یہ سوچ رہے ہیں کہ کل کے لئے عید کا فیصلہ کر دیا جائے یا ایک اور روزہ رکھوا دیا جائے۔ اگر انہوں نے کہہ دیا کہ کل عید ہے تو کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ کل کا روزہ رکھ لے۔ اور اگر ان کا فیصلہ یہ ہوا کہ کل کا روزہ رکھنا ہوگا تو کسی کو اس کی ہمت نہیں ہوگی کہ وہ عید کر لے۔ ان کے اس فیصلے کے خلاف نہ گورنر جنرل دم مار سکے گا نہ کمانڈر انچیف۔ نہ کوئی جج اس کے خلاف جا سکے گا نہ چیف جسٹس۔ سب کو اس فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا۔ نہ ان میں سے کوئی، اس فیصلے سے پہلے، اس معاملہ میں دخل دے سکتا ہے۔ نہ فیصلہ صادر ہونے کے بعد اس کے خلاف کہیں اپیل ہو سکتی ہے۔ پوری کی پوری قوم پر ان کی حکومت ہے۔ حالانکہ قوم ان فیصلہ کرنے والوں کو خوب جانتی اور پہچانتی ہے۔ حتیٰ کہ جس وقت لوگ ان کے فیصلہ کا انتظار کر رہے تھے۔ اُس وقت بھی ان کے متعلق آپس میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود فیصلہ انہی کا ماننا تھا نہ کسی اور کا۔ غور کیجئے کہ ان حضرات کی حکومت کتنے بڑے اقتدار و اختیار کی حکومت ہے۔

فیصلہ دینے کے بعد ان (فیصلہ دینے والوں) میں سے ایک صاحب اپنی گاڑی پر روانہ ہوئے۔ چوراہے پر پہنچے تھے کہ ٹریفک کے سپاہی نے سیٹی بجا کر روک لیا اور کہا کہ گاڑی کی بتیاں کیوں نہیں جلائیں۔ انہوں نے کہا کہ ایک بتی تو جل رہی ہے۔ دونوں کی کیا ضرورت ہے۔ سپاہی نے ڈانٹ کر کہا کہ بتیوں کا حکم چیف کمشنر صاحب کا دیا ہوا ہے۔ اس میں آپ کو مجال گفتگو نہیں۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے پرچہ کاٹ کر ان کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا کہ کل دس بجے تمیزی صاحب کی عدالت میں پیش ہونا ہوگا۔

کل عید ہوگی یا نہیں ہوگی ـــــ اس کا فیصلہ مسجد کے مولوی صاحب کریں گے۔
گاڑی کی بتیاں کس طرح جلائی جائیں گی ـــــ اس کا فیصلہ چیف کمشنر صاحب کریں گے۔
ایک ہی مملکت میں، ایک ہی شہر میں دو متوازی حکومتیں!!!

ایک اور منظر سامنے لائیے۔

پولوگراؤنڈ (کراچی) میں عید کی نماز کا اجتماع ہے۔ لاکھوں کا مجمع ہے۔ گورنر جنرل صاحب تشریف فرما ہیں۔ وزیر اعظم صاحب بھی دوزانو بیٹھے ہیں۔ کابینہ کے وزراء، چیف کمشنر، مجلس آئین ساز کے اراکین سب موجود ہیں۔ سندھ چیف کورٹ کے جج بھی۔ اور اتفاق سے فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس بھی۔ سب کسی کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ ہر ایک آنکھیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہا ہے۔ لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ بالآخر، عبا و قبا میں ملبوس ایک مولوی صاحب تشریف لاتے ہیں۔ انہیں آتا دیکھ کر بہت سی آنکھوں میں تحقیر کی ہنسی پھر جاتی ہے۔ بہت سے خندۂ زیر لبی سے ان کا استقبال کرتے ہیں۔ وہ آکر مصلے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور سب لوگ صف بستہ ان کے پیچھے خاموشی سے ایستادہ ہو جاتے ہیں۔ وہ جھکتے ہیں تو سب جھکتے ہیں۔ وہ اٹھتے ہیں تو سب اٹھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ منبر پر تشریف لے جاتے ہیں اور جو جی میں آتا ہے کہتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سنتے ہیں اور جی ہی جی میں ہنستے ہیں۔ کیونکہ ان کی باتوں میں سے اکثر ایسی ہیں جن پر ہر صاحب عقل و ہوش کو ہنسی آجائے۔ لیکن انہیں علانیہ ہنسنے کی جرأت نہیں۔ جب تک امام صاحب کا جی چاہا انہوں نے انہیں باندھ کر بٹھائے رکھا۔ کسی میں اتنا کہنے کی ہمت نہیں کہ وقت زیادہ ہو رہا ہے۔ ہمت اور جرأت کیسے ہو؟ یہاں ان کی حکومت ہے۔ یہاں انہی کے فیصلے چلیں گے۔ بہرحال انہوں نے خطبہ ختم کیا۔ دعا مانگی۔ محفل برخاست ہوئی۔ بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ یہ ایک طرف سے تیزی سے نکلنے لگے تو سپاہی نے ڈانٹ دیا کہ دیکھتے نہیں کہ یہ راستہ حضور گورنر جنرل کے لئے مخصوص ہے۔ ادھر ہٹ کر چلو۔ یعنی تمہاری حکومت کا دائرہ اور تھا۔ اب تم کسی اور کی مملکت میں پہنچ گئے ہو!

ایک ہی میدان میں، پانچ منٹ کے اندر اندر، حکومتیں بدل گئیں۔

* * * * *

اور تیسرا منظر بھی۔

جناب وزیر اعظم کے صاحبزادے کی شادی ہے۔ گورنر جنرل صاحب تشریف فرما ہیں۔ وزراء سلطنت، اعماد مملکت، اراکین مجلس آئین ساز، بڑی بڑی عدالتوں کے جج۔ سب زیب دہ محفل ہیں۔ دولہا مجلس میں ہے اور دولہن اندر کمرہ میں۔ سب کسی کے انتظار میں رہ رہ کر دروازے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ دیر ہوتی جا رہی ہے۔ چہ میگوئیاں سب کرتے ہیں لیکن سب بے بس سے ہیں۔ کافی انتظار کے بعد مولوی صاحب تشریف لاتے ہیں۔ سب تعظیم سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ (دولہا کے باپ) وزیر اعظم صاحب کو حکم دیتے ہیں کہ آپ اندر جائیے۔ وہاں یوں کیجئے اور یوں کیجئے۔ فلاں فلاں کو ساتھ لے جائیے۔ گورنر جنرل صاحب! آپ ادھر تشریف لائیے۔ چیف جسٹس صاحب! میں جو کچھ کہوں آپ اس کے گواہ رہیئے۔ وہ سب تعمیل ارشاد کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ کچھ اور الفاظ کہتے ہیں۔ دولہا (بلا سمجھے) ان الفاظ کو دہراتا ہے۔ ساری محفل ساکت و صامت بیٹھی ہے۔ پھر وہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ جتنا وقت جی چاہے دعا میں لگا دیتے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ ان سے سبقت کر کے اپنی دعا پہلے ختم کر لے۔ اس کے بعد وہ وزیر اعظم صاحب کو مبارک باد دیتے ہیں کہ ان کے صاحبزادہ کا نکاح، احکام شریعت کے مطابق بہ حسن و خوبی تکمیل پا گیا۔ انہوں نے جو کچھ کہا اس میں کسی کو دخل دینے کی اجازت نہ تھی[1]

---

[1] (فٹ نوٹ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ کریں)

کچھ عرصہ کے بعد اس نکاح کے متعلق ایک تنازعہ پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے لئے کوئی ان مولوی صاحب کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ بلکہ معاملہ اس عدالت تک پہنچتا ہے جسے وزیراعظم صاحب کی حکومت نے مقرر کر رکھا ہے۔ معاملہ ایسا ہے جس کے لئے پہلے سے کوئی واضح قانون موجود نہیں۔ لہٰذا ایک نیا قانون بنانے کے لئے اسے مجلس قانون ساز کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ادھر یہ ہوتا ہے اور اُدھر سے مولوی صاحبان کی طرف سے آواز آتی ہے کہ نکاح و طلاق کے بارے میں قانون بنانے والے تم کون ہوتے ہو؟ تمہیں یاد نہیں کہ یہ نکاح خود ہمارا پڑھایا ہوا ہے جب تم سب موجود تھے اور مولوی صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔ جب تمہیں نکاح پڑھانے کا حق نہیں تھا تو اب نکاح کے متعلق قانون بنانے کا حق کیسے حاصل ہو گیا۔ یہ ہمارے حدود و اختیارات کے معاملات ہیں جن میں تم دخل انداز نہیں ہو سکتے۔

غور کیجئے، کیا پاکستان کی آئین سازی کی ہشت سالہ لہ تاریخ اسی کشمکش و نزاع حدود و اختیارات ہی کی داستانِ الم انگیز نہیں؟ کیا یہاں آٹھ ۲ہ سال سے یہی نہیں ہو رہا کہ "قوم کے نمائندے" ایک آئین بناتے ہیں اور "خدا کے نمائندے"

لہ (فٹ نوٹ صفحہ ۳۱) یہ ۱۹۵۸ء کی بات تھی۔ اس میں اب اس واقعہ کو بھی شامل کر لیجئے جو روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت بابت ۲۸ اپریل ۱۹۷۸ء میں سامنے لایا گیا ہے یعنی:-

> راولپنڈی، ۲۷ اپریل (اپ پ) دارالفلاح راولپنڈی میں تین بیواؤں کی شادی کی پُرمسرت تقریب اس وقت کچھ بدمزہ ہو گئی جب نکاح خواں مولوی صاحب کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔ اس تقریب میں کمشنر اور ڈپٹی کمشنر راولپنڈی اور دیگر اعلیٰ سول حکام کی بیگمات کے علاوہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے مشیر شیخ رفیق اختر بھی موجود تھے۔ دولہا کے رشتہ دار ایک نکاح کی فیس ۵۰ روپے دینا چاہتے تھے۔ مگر نکاح خواں مولوی صاحب رفیع الدین مصر تھے کہ وہ ایک نکاح کی فیس ۱۰۰ روپے سے کسی طور کم نہیں لیں گے۔ پھر یہ بحث بڑھتے بڑھتے اچھے خاصے جھگڑے کی صورت اختیار کر گئی۔ دارالفلاح کے حکام نے تصفیہ کرانے کی کوشش کی اور مولوی صاحب سے کم فیس لینے کے لئے کہا مگر مولوی صاحب نہ مانے۔ پھر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے مشیر شیخ رفیق اختر نے بھی مولوی صاحب کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ فیس کم کریں مگر مولوی صاحب نہ مانے چنانچہ پولیس کو بلا کر مولوی صاحب کو اس کے حوالے کر دیا گیا۔

غور کیجئے کہ مجلس نکاح میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے مشیر رفیق اختر بنفس نفیس موجود تھے۔ ان کے علاوہ ادارہ دارالفلاح کے اربابِ حل و عقد بھی موجود ہوں گے۔ یہ سب مولوی صاحب ہی کی منتیں کرتے رہے کہ وہ فیس کم کر کے نکاح پڑھا دیں۔ کسی سے اتنا نہیں ہو سکا کہ وہ مولوی صاحب سے کہہ دے کہ آپ تشریف لے جائیے۔ ہم خود نکاح پڑھا دیں گے۔ قرآن کریم میں نکاح پڑھانے کا کوئی ذکر نہیں۔ مروجہ قانون کی رو سے بھی نکاح نامہ کا فارم پُر کر دینے سے نکاح مکمل ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس میں ایک خانہ "نکاح خواں کا نام" کے لئے بھی رکھا گیا ہے لیکن نکاح پڑھانے کے لئے کون سے اٹھارہ علوم دینی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بڑی آسان سی بات ہے لیکن ہم نے جس نکتہ کی تائید کے لئے یہ واقعہ درج کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو چکی ہے کہ نکاح "مولوی صاحب" ہی پڑھا سکتے ہیں۔ کوئی اور نہیں۔ حتیٰ کہ اربابِ حکومت بھی نہیں۔ یہ ہے اسلام کے متعلق وہ تصور جو بنیادی طور پر غلط ہے اور جس کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔

۲ہ یہ مقالہ ۱۹۵۸ء میں لکھا گیا تھا۔ اب تیس (۳۰) سال پڑھیے۔

یہ کہہ کر اسے ٹھکرا دیتے ہیں کہ تمہیں اس آئین سازی کا حق ہی حاصل نہیں۔ یہ مملکت اسلامی ہے۔ یہاں شریعت کا نظام نافذ ہوگا۔ اور نظامِ شریعت کے مطابق آئین و قوانین سازی کے حقدار ہم ہیں تم نہیں ہو! قوم کے نمائندے" کہتے ہیں کہ نہیں! ہمیں اس کا حق حاصل ہے۔ یہ کہتے ہیں اور ساتھ ہی عید کے چاند، نماز اور خطبہ اور اپنے بچوں کے نکاح کے لئے فیصلہ "خدا کے نمائندوں" سے طلب کرتے ہیں۔ بات بالکل صاف ہے۔ اگر رویتِ ہلال، خطبہ عید اور نکاح خوانی میں فیصلہ کا حق مولوی صاحب کو حاصل ہے تو یقیناً قانون سازی کا حق بھی اسی کو حاصل ہونا چاہیئے اور اگر قانون سازی کا حق اسے حاصل نہیں تو پھر ان امور میں فیصلوں کے لئے اس کی طرف کیوں رجوع کیا جاتا ہے؟ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ معاملات "شریعت" سے متعلق ہیں اس لئے ان کے لئے اربابِ شریعت ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ یہ ہے وہ اصلی نکتہ جس کی وضاحت کے لئے ہم نے اس قدر طویل تمہید اٹھائی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اسلام میں امورِ شریعت اور امورِ دنیا دو الگ الگ شعبوں سے متعلق ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے تو پھر ایک دفعہ بیٹھ کر اس کا فیصلہ کر لینا چاہیئے اور دونوں دوائر کی الگ الگ فہرستیں مرتب کر کے خدا کو خدا کی مملکت اور قیصر کو قیصر کی حکومت دے دینی چاہیئے۔

اور اگر یہ دوائر الگ الگ نہیں تو پھر اس شرکِ جلی کو ختم کرنا چاہیئے۔ کہ رویتِ ہلال کا فیصلہ مسجد میں ہو اور عید کی تعطیل کا فیصلہ وزارتِ امورِ داخلہ میں، مقامِ اجتماعِ عید کا تعین چیف کمشنر کی طرف سے ہو اور عید کی نماز مُلّا جیون پڑھائیں۔ وزیر اعظم صاحب کے لڑکے کا نکاح مولوی صاحب بندھائیں اور نکاح کے متعلق قوانین کا اجراء وزیر اعظم صاحب فرمائیں۔

یاد رکھیئے! ایک مملکت میں بیک وقت دو بادشاہ کبھی نہیں سما سکتے۔ جہاں ایسا ہوگا انارکی پھیل جائے گی۔ ماسکو میں قیصر ہی قیصر ہے۔ وہ خدا کو اپنے ہاں آنے نہیں دیتے۔ ویٹیکن (پوپ کی مملکت میں) "خدا ہی خدا" ہے۔ وہ قیصر کو اس مملکت میں قدم نہیں رکھنے دیتے۔ انگلستان میں "خدا" کو گرجا کی چار دیواری میں مقید کر دیا گیا ہے اور اس سے باہر قیصر کی مملکت ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی مملکت میں آ جا نہیں سکتے۔ لیکن ہم ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں "خدا اور قیصر" کی متوازی حکومت جاری کر رکھی ہے۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ (یعنی قرآن کے الفاظ میں) پستیوں اور بلندیوں میں ہر جگہ فساد ہی فساد ہے — کوئی چیز اپنے اصلی مقام پر نہیں اور تماشا یہ کہ ہر منبر اور ہر اسٹیج سے یہ آواز بھی برابر بلند ہوتی رہتی ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست، دین اور دنیا الگ الگ نہیں۔ ایسی صورت بھی دنیا میں شاید ہی کہیں اور دیکھنے میں آئی ہو۔ جب تک یہ دوعملی ختم نہیں کی جائے گی آپ کا ایک قدم بھی تعمیری منزل کی طرف نہیں اٹھ سکے گا۔

قرآنِ کریم کا فیصلہ اس باب میں بالکل واضح ہے۔ اس کی رُو سے دین اور دنیا دو الگ الگ شعبے نہیں۔ مملکت کا نظم و نسق، ہدایتِ خداوندی کی روشنی میں تمام ملت کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اس میں نہ کوئی خدا کا الگ نمائندہ ہے، نہ قیصر کا۔ جب نظم و نسقِ مملکت کے اس قرآنی تصور کے بجائے ہمارے ہاں قیصر (سلاطین) پیدا ہو گئے تو ان کے ساتھ ہی خدائی نمائندے (اربابِ شریعت) بھی معرضِ وجود میں آ گئے۔ لہٰذا اگر آپ نے قیصریت کو مٹانا ہے تو اس کے لئے مذہبی پیشوائیت کو ختم کرنا نہایت ضروری ہے۔ جب تک آپ کے ہاں قیصریت یا پیشوائیت کا ذرا سا عنصر بھی باقی ہے، مملکت کا نظم و نسق (قرآنی ہدایت کے مطابق) ملت کے سپرد کبھی نہیں ہو سکتا۔ اسلامی مملکت میں تمام امور قوانینِ خداوندی

کے مطابق حکومت ہی سرانجام دیتی ہے۔

(۰)

لیکن پیشوائیت کا مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے اس لئے اس کے حل کے لئے غور و فکر اور عملی اقدام کی ضرورت ہے۔ مذہبی پیشوا (مولوی حضرات) کوئی ایسا ہنر نہیں جانتے جس سے وہ اپنی روٹی آپ کما کھائیں۔ تقسیم سے پہلے پاکستانی علاقہ کی تمام مساجد آباد تھیں اور مذہبی مدرسوں کی اسامیاں بھی پُر تھیں۔ یہاں سے جو غیر مسلم ہندوستان کی طرف چلے گئے وہ اور سب کچھ تو چھوڑ گئے لیکن مسجدیں اور مذہبی مکتب تو چھوڑ کر نہیں گئے۔ اُدھر ہندوستان سے جس قدر مولوی صاحبان اِدھر آئے، وہ اپنے ساتھ مسجدیں اور مکتب لے کر نہیں آئے۔ اب سوچئے کہ جس ملک میں اس قسم کے لوگوں کا اتنا جمِ غفیر ہو جائے اور ان کے لئے سینگ سمانے کی کوئی جگہ نہ ہو وہ اپنی "خدائی نمائندگی" کے دعوے کو چھوڑ دیں تو روٹی کہاں سے کھائیں۔ لہٰذا جب تک قوم ان کے معاش کا انتظام نہیں کرے گی یہ اسی ذریعہ سے اکتسابِ معاش کرنے پر مجبور ہوں گے۔ جان کی حفاظت PRESERVATION OF SELF حیوانی جبلت کا بنیادی تقاضا ہے۔ لہٰذا اس تقاضے کی تسکین کا انتظام کرنا ضروری ہے۔ بنا بریں کرنے کا کام یہ ہے کہ:-

(۱) اس کا اعلان کر دیا جائے کہ اسلامی مملکت میں الگ مذہبی پیشواؤں کے وجود کی گنجائش نہیں۔

(۲) موجودہ مولوی صاحبان کے معاش کا انتظام حکومت کی طرف سے کیا جائے۔

(۳) آئندہ کے لئے الگ مذہبی مدارس کو قانوناً بند کر دیا جائے۔

(۴) دین کی تعلیم انہی مدرسوں اور کالجوں میں دی جائے جو آج محض دنیاوی تعلیم کے لئے جاری ہیں۔ اور

(۵) مملکت کا آئین نمائندگانِ ملت کے باہمی مشورہ سے اس طرح مرتب کر لیا جائے کہ اس میں کوئی چیز قرآن کی مقرر کردہ حدود سے ٹکراتی نہیں۔

اگر پاکستان نے یہ کچھ کر لیا تو یہ نہ صرف زندہ رہ سکے گا بلکہ پائندہ سے پائندہ تر ہوتا چلا جائے گا۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور موجودہ دوعملی اسی طرح سے رہی تو یہ دن بدن تباہی کی طرف بڑھتا چلا جائے گا۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے جس کی نتیجہ خیزی کسی کے روکے رُک نہیں سکتی۔

اگر ملک میں کوئی ایسا طبقہ موجود ہے جسے اپنی حفاظت، آنے والی نسلوں کی سلامتی، پاکستان کی بقاء اور شرفِ انسانیت سے بہرہ یاب ہونے کا کچھ بھی احساس ہے تو اسے سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیئے اور زندگی اور موت کے اس اہم سوال کا فیصلہ کر کے اٹھنا چاہیئے۔

زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نہ ماند

۲۔ ہماری مسجدیں

(طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۵۹ء میں شائع شدہ مقالہ)

ذرا ٹھہریئے اور اُس سامنے والی گلی کا سکوں سوز منظر نگاہوں کے سامنے لائیے!

قدم قدم پر ہمارے قوم کے نونہالوں کی ٹولیاں دوڑ بھاگ، کھیل کود، لہو و لعب اور رنگ رلیوں میں سرگرم کار ہیں۔ کہیں تاش اور کیرم کی بازی لگ رہی ہے۔ کہیں گلی ڈنڈے اور گیند بلے کی مشق ہو رہی ہے۔ کہیں فحش گانے گائے جا رہے ہیں۔ کہیں کبڈی بازی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ کہیں دنگا فساد، مار پیٹ اور گالی گلوچ کا سلسلہ بپا ہے (یہ روح فرسا مناظر آپ کو ہر شہر، قصبہ و قریہ میں ہر وقت نظر آئینگے۔)

اور پھر وہ دیکھئے! ایک معزز نوجوان گلی میں داخل ہوا۔ چاروں طرف یہ منظر دیکھتا چند قدم آگے بڑھا اور پھر یک دم رُک کر کچھ سوچنے لگا۔ چہرے کے آثار چڑھاؤ بتا رہے ہیں کہ کوئی دردمند اور صاحبِ فکر ہے جسے قوم کی تصویر کے اس رُخ نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ سنئے! وہ زبانِ حال سے آہستہ آہستہ حسرت ناک لہجے میں کہہ رہا ہے۔

"بارالٰہا! یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا یہی ہے ہماری وہ نسل جس نے آگے چل کر نظامِ مملکت کی باگیں سنبھالنی ہیں؟ کیا یہی ہیں ہماری امیدوں کے مرکز اور آرزوؤں کے وہ محور جو ملت کے آسمانِ تقدیر پر ستارے بن کر چمکیں گے؟ کیا یہی ہیں ہمارے مستقبل کے معمار؟ یا خدا! جب ان کی تربیت کا آغاز یہ ہے تو انجام کیا ہوگا؟ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ان کے والدین کا احساس کیوں مردہ ہو چکا ہے؟ حکومت کی ذمہ داری اور فریضہ کو کیا ہوا ہے؟"

ہیجان و اضطراب کی اس کیفیت نے اسے طلسمِ پیچ و تاب بنا دیا ہے۔ ناگاہ قریب کے دروازے سے ایک بوڑھی ماں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ اسی کو مخاطب کر رہی ہے۔

"کیا دیکھ رہے ہو بیٹا؟ ان شیطانوں کو کھڑے ہو کر! ہمارے لئے تو یہ زندگی کا مستقل روگ بن گئے ہیں۔ ان کی صبح و شام کی شرارتوں نے تو ہماری زندگی کو اجیرن بنا دیا ہے۔"

"انھیں سکول نہیں بھیجتے بی اماں! گھر پر بے کار رہ کر یہ بچے یہی رنگ نہ دکھائیں گے تو اور کیا کریں گے؟" یہ کہتے ہوئے نوجوان کے کان بی اماں کا جواب سننے کے لئے بیتاب تھے۔ بی اماں نے کہا۔

"کیا بتاؤں بیٹا تمہیں کہ اسکول میں داخل کرانے کے لیے کتنی دوڑ دھوپ کر چکے ہیں۔ کتنی سفارشیں کرائیں لیکن ہر اسکول سے یہی جواب ملا کہ جگہ کی کمی ہے۔ داخلہ پہلے ہی گنجائش سے زیادہ ہو چکا ہے۔ مزید گنجائش قطعاً نہیں۔ آخر اب کریں تو کیا کریں؟"

یہ سن کر وہ نوجوان بڑے پرحیرت انداز میں جس میں غم و الم کی کیفیت صاف جھلک رہی ہے بیساختہ بول اٹھتا ہے۔

"ہائیں! تو یہ سارا طوفانِ بدتمیزی اسکولوں میں جگہ کی کمی کے باعث بپا ہے؟ ہماری نئی نسل محض اس بنا پر ہلاکت کے جہنم کی طرف بڑھ رہی ہے کہ اسکولوں میں ان کے داخلے کی گنجائش نہیں رہی۔"

اور یہ کہتے ہوئے اس کی نگاہیں سامنے کی عظیم الشان عمارت کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ طویل و عریض ہال، سربفلک مینار، چمکتے ہوئے گنبد، وسیع صحن، باری باری اس کی نگاہوں کے سامنے آ رہے ہیں۔ ہاں! یہ اس محلہ کی مسجد ہے۔

"کیا یہ عظیم و وسیع عمارت ان نونہالوں کی درسگاہ نہیں بن سکتی؟"

نوجوان کی آواز میں اب جوش تھا۔ اس کی آواز سن کر قریب کے گھروں سے چند اہل محلہ نکل کر اس کے گرد جمع ہو گئے اور وہ گویا انہیں مخاطب کرتے ہوئے، بولتا چلا گیا۔

"ان مساجد میں ایسے بچوں کے پڑھنے کا انتظام کیوں نہیں کیا جاتا؟ یہ عظیم الشان عمارتیں نماز کے بعد سارا دن اور کس کام آتی ہیں؟ آخر اس میں کیا رکاوٹ ہے کہ جن بچوں کی زندگیاں اسکولوں میں داخلے کی عدم گنجائش کے سبب برباد ہو رہی ہیں ان کی تعلیم و تربیت کا سامان یہاں کر دیا جائے۔ ہماری مسجدیں ملک کے طول و عرض میں ہزاروں کی تعداد میں گلی گلی، کوچے کوچے پھیلی ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک ایک مسجد کی تعمیر پر ہزاروں اور لاکھوں روپے صرف ہوتے ہیں۔ اور اب بھی ہر سال ان کی مرمت اور دیگر انتظامات پر ہزاروں اور لاکھوں روپوں کا مجموعی طور پر خرچ اٹھتا ہے۔"

نوجوان ابھی یہاں تک کہنے پاتا ہے کہ ایک کرخت اور غضب آلود آواز سنائی دیتی ہے۔

"کیا کہہ رہے ہو تم مسٹر؟ ہوش کی دوا کرو۔ یہ مسجد ہے۔ خانہ خدا ہے۔ یہ نماز پڑھنے کے لئے ہے۔ اس سے دنیاداری کے کام نہیں لئے جا سکتے۔ انہیں بچوں کے اسکول نہیں بنایا جا سکتا۔ اس طرح تو مسجدوں کا سارا احترام ختم ہو جائے گا۔ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ مسجدیں ایسے کاموں کے لئے بھی استعمال ہوں۔"

یہ مسجد کے امام کی آواز تھی جو نوجوان کی گفتگو سن کر آہستہ آہستہ مسجد کی سیڑھیوں سے اتر کر قریب پہنچ گیا تھا۔

نوجوان یہ سب کچھ بڑے صبر اور ضبط سے سنتا رہا۔ اُسے خطیبِ شہر کا وہ خطبہ یاد آ گیا جو دو ہی دن پہلے انہوں نے شہر کی جامع مسجد میں دیا تھا۔ چنانچہ اس نے بڑی آہستگی سے امام مسجد کو مخاطب کر کے کہا

"مولانا! اگر آپ یہ سب کچھ درست فرما رہے ہیں تو پھر خطیبِ شہر کی جمعہ کی اُس تقریر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا اور بڑی ہی تفصیل سے فرمایا تھا کہ ـــ

"اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ زندگی کا ایک جامع اور اجتماعی نظام ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے

یہاں دین اور دنیا کی کوئی تفریق نہیں۔ مذہب اور سیاست میں کوئی حد فاصل نہیں۔ عیسائیت کی طرح (CHURCH) اور (STATE) کے الگ الگ دائرے نہیں۔ اس کے نظام میں سرتاپا ایک ہی وحدت جاری وساری ہوتی ہے۔ اور اس وحدت میں کسی نوع کی تفریق اور تقسیم ممکن نہیں۔"

اور پھر اس عظیم الشان دعوٰی کی تائید میں انہوں نے تاریخ کی روشنی میں یہ روایات بھی بیان کی تھیں کہ حضور رسالتمآب اور خلفائے راشدین رضکے عہد مبارک میں تمام مسائل زندگی مسجد کے اندر ہی طے پاتے تھے۔ مختلف معاملات طے کرنے کے لیۓ مجالس شورٰی مسجد ہی میں منعقد ہوتی تھیں۔ رؤسائے مملکت مسجد کے منبر سے ہی اپنے احکام اور فیصلے سناتے تھے اور وقت آنے پر وہی نماز کی امامت بھی کراتے تھے۔"

مولانا! آپ تو مسجدوں میں بچوں کی تعلیم کو خلاف شریعت قرار دے رہے ہیں۔ خطیب صاحب نے تو یہاں تک کہا تھا کہ :-

"حکومت کے مہمان و وفود بھی مسجد میں ہی ٹھہرائے جاتے تھے۔ حضرت حسّان بن ثابت رضکے حیات بخش نغمے بھی مسجد نبوی میں ہی گونجتے تھے اور حضور ختم مرتبت ؐ نے حبشیوں کا کھیل بھی مسجد نبوی میں ہی ملاحظہ فرمایا اور حضرت عائشہ رضکو دکھایا تھا۔"

اس کے بعد اس نوجوان نے امام مسجد سے کہا۔

"مولانا! ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ ہر منبر و محراب، ہر ایوان اسمبلی اور ہر ایک پبلک اسٹیج سے یہی آواز سنائی دیتی ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا کی تفریق قطعاً روا نہیں۔ یہ بھی زور شور سے اعلان کیا جاتا ہے کہ قرن اوّل میں مسجدیں ہمارے پارلیمنٹ ہاؤسس تھیں، سیکرٹریٹ تھیں۔ قومی دیوان خانوں کا درجہ رکھتی تھیں۔ دین کا ہر اہم معاملہ یہیں طے ہوتا تھا اور دوسری طرف جب قوم کی کوئی اہم ضرورت سامنے آئے تو مذہب کے اجارہ دار مساجد پر اپنی اجارہ داری اور تصرف قائم رکھنے کے لیے اس بات کے بھی روادار نہیں ہوتے کہ ان سے نئی نسل کی بگڑی بنانے کا کام لیا جاسکے ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ مسجدوں کو صرف پنجوقتہ نماز کے لیۓ مختص کر دینے کی رسم اس دور ملوکیت کا کرشمہ ہے جب اسلام امور مملکت اور امور شریعت کے الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا اور اس طرح اس کی وحدت ثنویت در دوعملی کی بھینٹ چڑھا دی گئی۔ ورنہ مسجدیں ہمارے نظام زندگی کے تمام امور کے مرکز کا درجہ رکھتی تھیں۔ اور انھیں حسب ضرورت ملی مقاصد اور ضروریات کے لیۓ استعمال میں لانا تقاضائے دین تھا۔

آپ غور فرمایئے کہ ان کی تعمیر پر مجموعی طور پر کروڑوں روپوں کے عظیم صرفے اور لاکھوں روپے سالانہ کے انتظامی اخراجات کے بعد ان سے کام کیا لیا جاتا ہے؟ کیا نماز کے اوقات کے بعد جو مجموعی طور پر دو تین گھنٹوں سے زیادہ نہیں ہوتے' باقی وقت میں ان سے کوئی کام لیا جاتا ہے؟

اقوام عالم میں اگر ہم باشعور قوم کہلانے کے مدعی ہیں تو یہ ضروری ہے کہ اپنی زندگی کے ان مسائل کو دیانتداری سے حل کریں اور مسجدوں سے تربیت گاہوں کا کام لے کر اس کمی کو پورا کریں جس کی وجہ سے ہماری نئی نسل تباہ ہو رہی ہے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ اول تو مدرسے بہت کم ہیں اور اس کی بنیادی وجہ عمارات کا نہ ہونا ہے۔ دوسرے ان مدرسوں میں دور دور سے بچے آتے ہیں جن کی ٹرانسپورٹ کا کوئی تسلی بخش انتظام نہیں۔ آپ دوپہر کے

وقت جبکہ درجہ حرارت ۱۱۲، ۱۱۳ تک پہنچ چکا ہوتا ہے۔ کسی مدرسے کے باہر بس اسٹینڈ پر کھڑے ہو جایئے اور دیکھئے کہ قوم کے ننھے ننھے پودے، چلچلاتی دھوپ میں، بس کے انتظار میں کس بے تابی سے کھڑے ہیں۔ بس آتی ہے اور ان میں سے دو چار بچوں کو لے کر آگے بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس میں اس سے زیادہ کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ باقی ماندہ بچے پھر دوسری بس کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بجے سکول سے چھٹی ہوئی اور بچہ چار بجے گھر پر پہنچا۔ اور یہ سارا وقت دھوپ میں گذارا۔ اس کے برعکس مسجد قریب قریب ہر محلہ میں موجود ہوتی ہے۔ پھر اس کا فاصلہ ہر گھر سے دس بیس قدم سے زیادہ نہیں ہوتا۔ صبح کی نماز کے بعد ظہر کے وقت تک (کہ یہی عام طور پر بچوں کے سکول کا وقت ہوتا ہے) وہ بالکل خالی پڑی رہتی ہے۔ محلے کے بچے کتنی آسانی سے اس میں تعلیم پا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مساجد کے امام خطیب اور مؤذن جو خطبہ جمعہ اور نمازوں کے بعد باقی اوقات میں فارغ رہتے ہیں، بچوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ ادا کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے مساجد میں خطیب اور امام ایسے متعین کئے جائیں جو بچوں کو تعلیم دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک پیسہ خرچ کئے بغیر نئی نسل کے لاکھوں آوارہ بچے جنہیں سکولوں میں داخلہ نہیں ملتا تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ ہو جائینگے۔ اور تباہی کے جس سیلاب میں ان کی زندگیاں بہے چلی جا رہی ہیں اس سے بچا کر انہیں صحیح راستہ پر ڈالا جا سکے گا۔

ہم ارباب حکومت سے درخواست کرینگے کہ وہ ہماری اس تجویز پر سنجیدگی سے غور فرمائیں۔

(۰)

جیسا کہ کہا جا چکا ہے، یہ مقالہ جولائی ۱۹۵۹ء میں لکھا گیا تھا۔ بچوں کی تعلیم کا مسئلہ آج، اس زمانے کے مقابلہ میں سینکڑوں گنا زیادہ مشکل، پیچیدہ اور پریشان کن بن چکا ہے۔ عام سرکاری سکولوں میں بچوں کو بھیجئے تو سوائے اس کے کہ وہ بازاری گالیوں کے حافظ بن جائیں، اور کچھ نہیں سیکھتے۔ "اعلیٰ معیار" کے سکول (جنہیں پبلک سکول یا انگلش میڈیم اسکول کہا جاتا ہے) ان میں بچوں کو داخل کرانا اور سکول کے مطالبات پورے کرنا، لانا ہے جوئے شیر کا۔ داخلے کے متعلق ایک حالیہ واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔ جسے ایک عزیزہ نے سنایا۔ وہ بچے کو ابتدائی کلاس (نرسری یا کنڈر گارٹن) میں داخل کرانے کیلئے لے گئیں تو جواب ملا کہ اس وقت تو اس کی قطعاً گنجائش نہیں۔ البتہ اس کا نام آپ فہرست منتظرین (WAITING LIST) میں درج کرا دیجئے جس کی فیس پچاس روپے ہے۔ یعنی صرف رجسٹریشن کی فیس۔ پوچھا کہ اس بچے کے داخلہ کی باری کب آئے گی تو جواب ملا کہ حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ شاید ۱۹۷۱ء میں باری آجائے۔ اس وقت اگر بچے کی عمر چار سال یا اس سے کم ہو گی تو داخل ہو سکے گا۔ اور بچے کی اس وقت عمر چار سال کی تھی۔ اس دشواری کی بنیادی وجہ جگہ کی کمی بتائی گئی۔

اخراجات کا یہ عالم ہے کہ ایک سو روپیہ فیس داخلہ کے علاوہ کم از کم ۱۶۵/- روپے ماہوار سب سے نچلے درجے کی فیس ہے۔ بچوں کی یونیفارم، اسٹیشنری، کتابیں، تقریبات کے چندے اس پر مضاعف ہیں۔

ان دشواریوں کے پیش نظر حال ہی میں یہ آوازیں اٹھنی شروع ہوئی ہیں کہ مسجدوں کو درسگاہوں کے طور پر استعمال کیا جائے۔ ہم نے اس مقالہ کی بار دگر اشاعت یہ بتانے کے لئے بھی ضروری سمجھی ہے کہ طلوع اسلام کی طرف سے یہ تجویز ۱۹۵۹ء میں پیش کی گئی تھی۔ جسے ارباب دانش اور اصحاب اقتدار میں سے کسی نے درخور اعتنا نہ سمجھا اور مولوی صاحبان کی طرف سے طلوع اسلام پر کفر کے فتوے لگنے شروع ہو گئے کہ یہ شریعت کے معاملات میں خواہ مخواہ دخل اندازی ہوتا ہے۔

دیکھیں۔ اب اس تجویز کا کیا حشر ہوتا ہے؟

حقائق و عبر

۱۔ قائدِ اعظمؒ کا جنازہ

گذشتہ فروری میں ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن سرگودہا سے خطاب کرتے ہوئے، میاں طفیل محمد اور پروفیسر غفور احمد صاحب نے اپنے مشترکہ جوابات میں کہا:۔

قائدِ اعظمؒ کی نمازِ جنازہ میں شرکت ضروری نہیں تھی اور نہ ہی تمام مسلمانوں کے لئے ایسا کرنا ممکن تھا۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ مولانا مودودی اور خود انہوں نے قائدِ اعظمؒ کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی تھی۔ ان سے جب یہ پوچھا گیا کہ کیا مولانا مودودی نے بھی قائدِ اعظمؒ کو اپنا قائد تسلیم کیا تھا تو یہ جواب دیا گیا کہ مولانا مودودی خود قائد ہیں اس لئے وہ قائدِ اعظمؒ کو اپنا قائد کیوں مانتے۔

(مساوات۔ مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۷۸ء)

واضح رہے کہ (جہاں تک ہمیں معلوم ہے) مودودی صاحب نے علامہ اقبالؒ کی نمازِ جنازہ میں بھی شرکت نہیں کی تھی حالانکہ وہ اس زمانے میں حضرت علامہ کے قائم کردہ دارالاسلام میں مقیم تھے جو لاہور سے کچھ زیادہ دور نہ تھا اور مودودی صاحب علامہ اقبالؒ کو کم از کم اپنا "مادی سہارا" تسلیم کرتے تھے۔

(۰)

۲۔ پیشۂ وکالت

مذکورہ صدر بار کے اجلاس میں ان حضرات نے یہ بھی فرمایا کہ:۔

مودودی صاحب نے وکالت کے پیشے کو حرام قرار نہیں دیا۔ (ایضاً)

پیشۂ وکالت کے متعلق مودودی صاحب کے ارشادات ملاحظہ فرمایئے جو انہوں نے ایک مستفسر کے سوال کے جواب میں ارزانی فرمائے تھے۔ انہوں نے کہا تھا:۔

وکالت کو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ قانونِ الٰہی کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر کسی دوسرے پیشے میں کچھ حرام کی آمیزش ہو بھی تو بہرحال وہ بغاوت سے تو کم درجہ ہی کا گناہ ہے۔ تجارت،

زراعت، صنعت و حرفت، مزدوری، پرائیویٹ فرموں میں ملازمتیں اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں ایسی صورتیں بہم پہنچ سکتی ہیں جن کے اندر کم سے کم ناگزیر معصیت کی حد پر آدمی قائم رہ سکتا ہے اور وہ کم از کم اس درجہ میں تو حرام نہیں ہیں جس درجہ کی یہ وکیلانہ بغاوت حرام ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "وکیل کے محرر کا کام بھی حرام ہے"۔

(ترجمان القرآن۔ بابت جنوری۔ فروری ۱۹۴۲ء)

ضمناً، انہوں نے بینکوں کی ملازمت کے متعلق بھی فرمایا تھا کہ "یہ ایسی ہی ہے جیسے کوئی محتسبہ خانے یا شراب خانے میں ملازمت کرے"۔ (ایشیا۔ ۱۳ مئی ۱۹۶۷ء۔ بحوالہ طلوع اسلام۔ جون ۱۹۶۷ء)

پیشۂ وکالت کے متعلق مودودی صاحب کا فیصلہ ملاحظہ فرمایئے۔ اور اس کے بعد میاں طفیل محمد اور پروفیسر غفور احمد صاحب کے اس ارشاد پر غور کیجئے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ "مودودی صاحب نے وکالت کے پیشے کو حرام قرار نہیں دیا"۔

لطف یہ ہے کہ یہ حضرات یہ سب کچھ مودودی صاحب کی زندگی میں اور ان کی موجودگی میں فرما رہے ہیں۔ اور اس جماعت کے عام اراکین تو ایک طرف، خود مودودی صاحب بھی انہیں یہ نہیں کہتے کہ آپ غلط بیانی سے کیوں کام لیتے ہیں؟

(۰)

۳۔ ہندو کیا ہے؟

اس خبر کو غور سے پڑھیئے جو ڈیلی ٹیلیگراف (لنڈن) کے حوالے سے ہمارے اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔

بھارت کی حکمران پارٹی کے ایک لیڈر پروفیسر بلراج مدھوک نے اپنے دورۂ جموں و کشمیر کے دوران پیش گوئی کی ہے کہ (خدا نخواستہ۔ طلوع اسلام) پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا ہے کہ بلوچستان ایران میں شامل ہو جائے گا اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ افغانستان میں۔ جبکہ پنجاب اور سندھ کے صوبے بھارت کے ساتھ مل جائیں گے ..... انہوں نے یہ بھی کہا کہ پورا کشمیر بھارت کے حوالے کیا جانا چاہیئے۔ (نوائے وقت۔ ۲۲ فروری ۱۹۷۸ء)

کشمیر کے متعلق جو کچھ بھارت کے وزیر خارجہ باجپائی صاحب نے دورۂ پاکستان کے بعد فرمایا تھا اس کی یاد تو قارئین کے ذہنوں میں تازہ ہوگی۔ (حوالہ کے لئے دیکھئے پاکستان ٹائمز۔ بابت ۲۱ مارچ ۱۹۷۸ء)

(۰)

۴۔ کوڑوں کی سزا

اخبارات میں شائع شدہ یہ خبر توجہ طلب ہے:۔

جماعت اسلامی کے راہنما اور پی۔ این۔ اے کے سیکرٹری جنرل مسٹر غفور احمد نے بی۔ بی۔ سی کے نمائندے

وقار احمد کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ "نام نہاد اسلامی سزائیں دراصل مارشل لاء کی سزائیں ہیں جنھیں نافذ کرتے وقت ہم سے مشورہ نہیں لیا گیا"۔ (مساوات۔ کراچی۔ مورخہ ۲۸ اپریل ۱۹۷۸ء)

پروفیسر غفور احمد صاحب سے دریافت طلب سوال یہ ہے کہ اگر آپ ان سزاؤں کو اسلامی نہیں سمجھتے تو کیا آپ نے (یا آپ کی جماعت نے) مارشل لاء حکام کو اس سے متنبہ فرمایا ہے؟

(۰)

۵۔ قطع ید کی سزا

مفتی محمود صاحب نے "مسجد شیرانوالہ گیٹ (لاہور) میں خطبہ جمعہ کے دوران ارشاد فرمایا:۔

چور کے ہاتھ کاٹ دینے کی سزا، اسلامی سزا ہے جسے اسلامی مملکت میں ضرور نافذ ہونا چاہیئے۔ اس سزا کے خلاف تنقید کرنے والے یہ خیال کرتے ہیں کہ ملک کی موجودہ معاشی حالت اور غربت وافلاس کی موجودگی میں اس قسم کی سزاؤں کی کوئی وجہ جواز نہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ (صدر اول میں) جب یہ سزائیں نافذ کی گئی تھیں تو وہاں کے معاشی حالات ہمارے موجودہ معاشی حالات سے کچھ بھی بہتر نہیں تھے۔ (پاکستان ٹائمز۔ ۲۹ اپریل ۱۹۷۸ء)

یہ مفتی صاحب کا فتویٰ ہے۔ اس کے برعکس اقامت دین کے مدعی: ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے اسلامی سزاؤں سے متعلق ارشادات آپ طلوع اسلام بابت جون ۱۹۷۸ء میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ان میں سے دو چار اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "تفہیمات حصہ دوم" میں اس اہم موضوع پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

اسی پر حدِ سرقہ کو بھی قیاس کر لیجیئے کہ وہ صرف اس سوسائٹی کے لئے مقرر کی گئی ہے جس میں اسلام کے معاشی تصورات اور اصول اور قوانین پوری طرح نافذ ہوں۔ قطع ید اور اسلامی نظمِ معیشت میں ایسا ربط ہے جس کو کبھی منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں یہ نظمِ معیشت قائم ہو وہاں قطع ید ہی عین انصاف اور عین مقتضائے فطرت ہے اور جہاں یہ نظمِ معیشت نہ ہو وہاں چور کا ہاتھ کاٹنا دوہرا ظلم ہے۔ حقیقت میں ہاتھ کاٹنے کی سزا اس ظالم سوسائٹی کے لئے مقرر ہی نہیں کی گئی ہے جس میں سود جاتا ہو۔ زکوٰۃ متروک ہو۔ القائے قیمت فروخت کیا جاتا ہے ٹیکسوں کی بھرمار سے ضروریاتِ زندگی نہایت گراں ہوگئی ہوں اور تمام ٹیکس چند مخصوص طبقوں کے لئے سامانِ عیش فراہم کرنے پر صرف ہوتے ہوں۔ ایسی جگہ تو چوری کے لئے ہاتھ کاٹنا ہی نہیں بلکہ قید کی سزا بھی بعض حالات میں ظلم ہوگی۔ (صفحہ ۲۸۱-۲۸۳)

اس کے بعد انہوں نے صدر اول کی تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا:۔

اقامتِ حدود میں وقت کے حالات اور ملزم کے حالات کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔ زمانہ جنگ میں حد موقوف رکھی جاتی ہے۔ قحط کے ۔۔۔۔۔ زمانے میں بھی چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا۔ ملزم کے حالات سے اگر ثابت ہو کہ حقیقت میں وہ چوری پر مجبور ہو گیا تھا تب بھی اس کے ساتھ رعایت کی جاتی ہے۔ مثلاً حاطب ابن ابی بلتعہ کے غلاموں کا قصہ آثار میں منقول ہوا ہے کہ انہوں نے قبیلہ مزینیہ کے ایک شخص کا اونٹ چرا لیا تھا

مزنی نے آکر حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ آپؓ نے مقدمہ کی تحقیقات کے بعد حکم دے دیا کہ ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں۔ پھر دفعۃً آپ کو ان غلاموں کے حالات کی طرف توجہ ہوئی۔ اور آپ نے فرمایا کہ تم نے ان غریبوں سے کام لیا مگر ان کو بھوکا مار دیا۔ اور اس حال کو پہنچایا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص حرام چیز کھالے تو اس کے لئے وہ جائز ہو" یہ کہہ کر حضرت عمرؓ نے ان غلاموں کو چھوڑ دیا اور ان کے مالک حضرت حاطب سے اونٹ والے کو تاوان دلوایا۔ اس قسم کی اور متعدد مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا قانون اندھا قانون نہیں ہے بلکہ وہ فرق کرتا ہے اس شخص میں جو حقیقۃً ارتکاب جرم پر مجبور ہو گیا ہو اور اس شخص میں جس نے حقیقی مجبوری کے بغیر جرم کیا ہو۔ اسی بناء پر غیر شادی شدہ زانی، اور شادی شدہ زانی کی سزا میں فرق کیا گیا ہے۔ اور اسی بناء پر قحط کے مارے ہوئے شخص اور کھاتے پیتے شخص کی چوری کو ایک مرتبے میں نہیں رکھا گیا۔　　(ایضاً ص۲۷۹)

مودودی صاحب اپنے ارشادات کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں :-

اس سلسلے میں اپنے دلائل دیتے ہوئے میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی قانونِ فوجداری کی دفعات اس مملکت کے لئے ہیں جس میں پورا اسلامی نظامِ زندگی قائم ہو نہ کہ اس مملکت کے لئے جس میں سارا نظام کفر کے طریقوں پر چل رہا ہو اور صرف ایک چوری یا زنا کی سزا اسلام کے قانون سے لے لی جائے۔ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا عین انصاف ہے، اگر ملک کا معاشی نظام بھی اس کے ساتھ اسلامی احکام کے مطابق ہو۔ اور یہ قطعی ظلم ہے اگر ملک میں اسلام کے منشاء کے خلاف سود حلال اور زکوٰۃ متروک ہو اور حاجت مند انسان کی دستگیری کا کوئی انتظام نہ ہو۔ اس ساری گفتگو میں سے اگر کوئی شخص اتنی سی بات نکال لے کہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کو یہ شخص ظلم کہتا ہے تو آپ خود ہی سوچئے کہ اس کی سخن فہمی کا ماتم کیا جائے یا دیانت کا۔

(رسائل و مسائل حصہ چہارم۔ ص۱۵۰-۱۵۱۔ اشاعت اول)

اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں :-

اس وقت اگر کوئی مسلمان حکومت اسلام کے تمام احکام و قوانین اور اس کی ساری اصلاحی ہدایات کو معطل رکھ کر اس کے قوانین میں سے صرف حدودِ شرعیہ کو الگ نکال لے اور عدالتوں میں ان کو نافذ کرنے کا حکم دے دے تو جو قاضی یا جج کسی زانی یا سارق یا شاربِ خمر پر حد جاری کرنے کا حکم دیگا۔ وہ تو ظالم نہیں ہوگا البتہ وہ حکومت ضرور ظالم ہوگی جس نے شریعت الٰہیہ کے ایک حصے کو معطل اور دوسرے حصے کو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔　　(ایضاً۔ ص۲۷۲-۷۳)

آپ غور فرمائیے کہ ان ہر دو حضرات میں سے کس کا فیصلہ مطابق اسلام تسلیم کیا جائے گا؟ حیرت ہے کہ اب جبکہ ملک میں شرعی سزاؤں کا عام چرچا ہے، مودودی صاحب نے اپنے ان خیالات کو اربابِ حکومت کے سامنے پیش کیوں نہیں کیا؟

———(۰)———

۶۔ خلافت راشدہ کے نمونے کی حکومت

جماعت اسلامی کے ترجمان 'ایشیا' کی ۶ ؍ فروری ۱۹۷۰ء کی اشاعت کے صفحہ اول پر کہا گیا ہے (جو غالباً مودودی صاحب کے کسی خطاب کے الفاظ ہیں)۔

اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا ہے کہ ہم ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کی حکومت کی طرح ایک حکومت قائم کر دیں۔ نہ بندوں کو اس بات کی طاقت حاصل ہے نہ خدا نے اس کی تکلیف دی ہے۔ البتہ یہ مطالبہ ہم سے کیا گیا ہے کہ ہم اقامتِ دین کے لئے جدوجہد کریں۔

(یہ الفاظ خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ "نہ بندوں کو اس بات کی طاقت حاصل ہے")۔ لیکن اس جماعت نے اپنے منشور میں کہا تھا کہ :۔

جماعت اسلامی کے پیشِ نظر پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانا ہے جو کتاب و سنت کے اتباع کی پابند ہو۔ اور خلافتِ راشدہ کے نمونے کی پیرو ہو۔ (بحوالہ طلوع اسلام۔ بابت فروری ۱۹۷۰ء۔ صفحہ ۳۲)

اس اجمال کی تفصیل ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۵۵ء میں شائع شدہ ایک مقالہ میں دی گئی ہے جس کا عنوان ہے ۔ سنت خلفائے راشدین ۔ اس میں حدیث فعلیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین مھدیین کو نقل کرنے کے بعد کہا ہے۔

اس حدیث میں دیکھیے "سنۃ الخلفاء الراشدین" کے الفاظ صاف موجود ہیں۔ بلکہ راشدین کے بعد ایک لفظ "مھدیین" کا اضافہ بھی ہے۔ اس میں نہایت واضح الفاظ میں حضورؐ نے اپنی سنت کے ساتھ خلفائے راشدین کی سنت کا ذکر بھی فرمایا ہے اور اپنی سنت ہی کی طرح اس پر قائم رہنے کی وصیت بھی فرمائی ہے۔

رہا یہ سوال کہ جس طرح آج خلفائے راشدین کا لفظ جب بولا جاتا ہے تو اس سے خلفائے اربعہ مراد ہوتے ہیں اسی طرح جب حضورؐ نے یہ الفاظ استعمال فرمائے تو کیا اس وقت بھی لوگوں نے ان الفاظ سے خلفائے اربعہ ہی کو سمجھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کلام کی نوعیت ایک واضح اور قطعی حکم کی نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ خود حدیث سے واضح ہے ایک پیشین گوئی اور ایک وصیت کی ہے اور خلفائے راشدین سے یہاں متعین اور مخصوص اشخاص مراد نہیں ہیں بلکہ آپ کے وہ جانشین مراد ہیں جو آپ کے بعد آپ کی امت کی زمامِ کار اپنے ہاتھوں میں سنبھالیں گے اور حضورؐ ہی کے طریقہ پر اپنے فرائض انجام دیں گے۔ اس لفظ کے اندر وہ تمام خلفائے راشدین داخل ہیں جو آپ کی امت کے اندر پیدا ہوتے یا آئندہ پیدا ہوں گے اور حکومت کے فرائض صحیح اسلامی طریق پر انجام دیں گے۔

اگر کسی کو یہ گمان ہو کہ حضورؐ کے ذہن میں اپنے بعد کسی خلافت کے قیام یا خلفاءؐ کے کسی سلسلہ کا کوئی تصور نہیں ہوسکتا تھا تو ہمارے نزدیک یہ گمان بالکل غلط ہے۔

آگے چل کر کہا گیا ہے :۔

کوئی وجہ نہیں کہ اب یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ آئندہ کبھی اس دنیا میں خلافت علیٰ منہاج النبوت کا دور نہیں آئے گا۔ نہ نقل میں ہمیں کوئی ایسی چیز ملتی ہے جو اس کا دروازہ بند کرتی ہو اور نہ عقلاً اس کا آنا کسی طرح محال اور مستبعد قرار دیا جا سکتا ہے۔ کس قدر دلچسپ ہیں یہ حضرات!

(۰)

۷۔ قرآن مجید میں تحریف

روزنامہ "نوائے وقت" میں ایک مستقل عنوان ہے۔ نورِ بصیرت۔ اس عنوان کے تابع اس کی یکم اپریل ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں تحریر ہے:-

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے یقیناً بنی آدم کو تکریم دی ہے۔ (۱۷:۷) — صحیح حوالہ ۱۷:۷۰ ہے)

پھر اسے زمین پر اپنا نائب مقرر فرمایا۔ (خلیفۃ اللہ فی الارض)

قرآن کریم میں کہیں بھی "خلیفۃ اللہ فی الارض" کے الفاظ نہیں آئے۔ نہ ہی اس مضمون کی کوئی آیت ہے کہ خدا نے انسان کو زمین پر اپنا نائب مقرر کیا ہے۔ اس میں صرف اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (۲:۳۰) کے الفاظ آئے ہیں جن کے معانی "اللہ کا خلیفہ یا نائب نہیں" انسان کے "خدا کے نائب" ہونے کا تصور ہی باطل ہے۔ تفصیل اس کی پرویز صاحب کی کتاب "ابلیس و آدم"۔ یا "مطالب الفرقان" جلد دوم میں ملے گی۔

(۰)

۸۔ حضرت عائشہ کی عمر بوقتِ نکاح

ہمارے ہاں شروع سے یہ بات بطور مسلمہ چلی آ رہی ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت چھ سال کی اور رخصتی کے وقت نو سال کی تھی۔ اس پر معاندینِ اسلام کی طرف سے جو جگر سوز اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ پرویز صاحب نے ایک عرصہ کی غائر تحقیق کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ یہ بات واقعہ کے خلاف ہے۔ حضرت عائشہؓ کی عمر بوقت نکاح سترہ اور انیس سال کے درمیان تھی۔ ان کا یہ مقالہ پہلے نومبر ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اور پھر اسے "طاہرہ" کے نام خطوط" کی دوسری جلد میں شامل کر دیا گیا۔ پرویز صاحب کے اس مقالہ کے شائع ہونے پر بجائے اس کے کہ مذہبی حلقہ ان کا شکر گذار ہوتا کہ انہوں نے معاندین کے اعتراضات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر کے رکھ دیا ہے، ان کے خلاف طوفان برپا کر دیا گیا کہ یہ شخص منکرِ حدیث ہے۔ جو صحیح احادیث کا انکار کر رہا ہے۔

مجلس حزب الانصار "بھیرہ" کی طرف سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے "شمس الاسلام"۔ اس کی جنوری ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "سیدۃ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا"۔ اس میں صاحب مقالہ نے انہی اسناد کے حوالہ سے جنہیں پرویز صاحب نے پیش کیا تھا۔ یہ ثابت کیا ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر انیس سال کی تھی اس کے بعد تحریر کیا ہے۔

سیدۃ عائشہ صدیقہؓ کی عمر سے متعلق اس صاف ستھری اور بے غبار حقیقت کے ہوتے ہوئے بھی نکاح اور رخصتی کے وقت چھ اور نو برس والی روایت کو قبول کرنا ہرگز ہرگز درست نہیں جسے سن کر نہ صرف انسانیت و

شرافت کا سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔ بلکہ معلم اخلاق جناب محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ و اصحابہ و سلم) کی مقدس شان میں گستاخی بھی لازم آتی ہے۔ (ص ۳۱-۳۰)

'شمس الاسلام' میں اس بیباکانہ اظہار حقیقت کے خلاف، مذہبی پیشوائیت کی طرف سے نہ کوئی مخالفت کا طوفان بپا ہوا ہے نہ ہی اس کے خلاف منکر حدیث ہونے کا فتویٰ صادر کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ پرویز صاحب کے خلاف ان حضرات کی طوفان انگیزی کی وجہ حدیث کے متعلق ان کا عقیدہ نہیں — اس کا سبب کچھ اور ہے۔

بہرحال، ہم مؤقر جریدہ شمس الاسلام کو مستحق تبریک و تہنیت قرار دیتے ہیں کہ اس نے اس جرأت سے حق گوئی کے فریضہ کو ادا کیا ہے۔ اللھم زد۔ فزد۔

(۰)

۹۔ شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کا عقیدۂ حدیث

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب کا خط ملاحظہ فرمائیے۔

"مولانا حسین احمد مدنی اپنے ایک مکتوب میں یوں رقمطراز ہیں:۔

قرآن کریم جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے تواتراً منقول ہے۔ یعنی اس کو نقل کرنے والے ہر زمانہ میں اس قدر نفوس کثیرہ ہے جن میں جھوٹ بولنے یا غلطی کرنے کا احتمال باقی نہیں رہتا۔ اس لئے قرآن کریم کا منکر کافر ہے اور اس کو ماننا عقلاً اور نقلاً ضروری ہے۔ اس کے ماسوا اور احادیث خواہ قدسیہ ہوں یا غیر قدسیہ، ان کے نقل کرنے والے اتنے کثیر نفوس نہیں ہیں۔ اس لئے ان میں عقلاً غلطی یا جھوٹ کا آنا ممکن ہے اس لئے یہ قطعی الثبوت نہ ہوگی اور ان کا منکر کافر نہ ہوگا۔"

(مکتوب شیخ الاسلام حسین احمد مدنی صاحب۔ جلد اول صفحہ ۱۰۰ مطبوعہ استقلال پریس لاہور مکتوب نمبر ۳۸)

"مکتوب مدنی کے مندرجہ بالا حصے کو پڑھنے سے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے شاگرد اور پیرو کس منہ سے دوسروں کو منکر حدیث اور کافر کہتے ہیں؟ یا للعجب!"

(۰)

۱۰۔ علاج بالقرآن

تصوف کی کتابوں میں ایک قصہ پڑھا کرتے تھے کہ شیخ مبارک (جن کا شمار سرخیل زمرۂ اولیاء کرام میں ہوتا ہے) کے ایک خلیفہ سو رہے تھے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ، خضر صورت، تشریف لائے ہیں اور ان سے کہہ رہے ہیں کہ تمہیں معلوم نہیں کہ امسال حج اکبر ہے اور تم پڑے سو رہے ہو۔ اٹھو اور سفر کی تیاری کرو۔ اس پر وہ گھبرا کر اٹھے، معلوم کیا تو اس سال واقعی حج اکبر تھا۔ فوراً سفر کی تیاری شروع کر دی۔ اس بات کا چرچا عام ہوا تو ان کے مریدوں کی تعداد میں، رغبت سفر باندھنے لگے کہ پیر کی معیت میں عام حج کا ثواب بھی حج اکبر جتنا ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ حج اکبر ادا کرنے کی

سعادت پیر کی معیت میں میسر ہو جائے۔ چنانچہ اس طرح ہزاروں پر مشتمل قافلہ حج کے لئے تیار ہو گیا۔

شیخ مبارک کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے خلیفہ سے پوچھا کہ یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی؟ انہوں نے اپنے خواب کا ماجرا بیان کیا تو شیخ نے فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ وہ خضر صورت بزرگ کون تھا؟ وہ شیطان تھا۔

خلیفہ نے حیرت سے کہا کہ یا حضرت! شیطان کا کام تو انسان کو نیک راستے سے بہکانا ہے اور اس نے مجھے حج کبر کے لئے جانے پر آمادہ کیا۔ یہ کام شیطان کا کس طرح ہو سکتا ہے؟

شیخ نے فرمایا کہ بیٹا! شیطان نے تمہیں نیک راستے سے بہکایا ہے۔ امیر المومنین نے جہاد کی تیاری کا حکم دیا ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ لوگ حج کے لئے روانہ ہو جائیں تاکہ سلطان کا جہاد ناکام رہ جائے۔

اس قسم کی ہوتی ہیں ابلیس کی چالیں!

پاکستان میں خدا خدا کر کے قرآن کی آواز فضا میں عام ہونے لگی تھی اور یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ وہ اسلامی مملکت کے لئے ضابطۂ آئین و قوانین ہے (بطور تحدیثِ نعمت عرض ہے کہ طلوع اسلام اپنی اس سعادت پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے کہ قرآن کے لئے ایسی فضا اور اس کے صحیح مقام کے عام کرنے میں اس کی سعی پیہم کا قابلِ فخر حصہ ہے) قرآن کا یہ تذکرہ عام ہونے لگا تھا کہ ملک میں "علاج بالقرآن" کے نام سے ایک تحریک ابھاری گئی جس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآنی آیات کے ورد وظیفوں سے تمام جسمانی امراض کا علاج ہو سکتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس میں کتنی گہری سازش پنہاں ہے؟ قرآن کے نام کی عظمت بدستور قائم رکھی گئی ہے لیکن اس کا مقصود و منتہیٰ بدل دیا گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ اسے انسانیت کے امراض کا معالج قرار دیا جائے، اسے جسمانی بیماریوں کے دفعیہ کے لئے ورد و وظیفہ اور گنڈے تعویذ کے مقام پر لا کھڑا کیا گیا ہے۔

آپ اس واقعہ کو سامنے رکھئے اور پھر مطالعہ کیجئے ارمغانِ حجاز کی اس نظم کا جس کا عنوان ہے — ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ اس میں ابلیس کا ایک مشیر اس خدشہ کا اظہار کرتا ہے کہ — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں — تو ابلیس اس سے کہتا ہے کہ تم میرے پروگرام پر عمل کرو، پھر دیکھو کہ یہ خطرہ کس قدر موہوم ثابت ہو جاتا ہے۔ اور وہ پروگرام یہ ہے کہ:-

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے — تا بساطِ زندگی پہ اس کے سب مہرے ہوں مات۔

اس کے لئے

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے — پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے۔

قرآن مجید کو ضابطۂ حیات نہ بننے دو۔ اسے ورد وظیفوں کا مجموعہ بنا کر پیش کرو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی مخالفت کرنے والوں کا ایک حربہ یہ بھی بتایا تھا کہ اَلَّذِیْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ۔ (۱۵/۹۱) "یہ لوگ قرآن کو جنتر منتر اور گنڈہ تعویذ کا مجموعہ بنا کر رکھ دیں گے۔" سو وہی کچھ قرآن کے ساتھ ہو رہا ہے۔

کس قدر غیر مرئی، لطیف اور بظاہر معصوم بلکہ مقدس ہوتے ہیں ابلیس کے حربے!

حجِ بدل کی شرعی حیثیت

از پروفیسر رفیع اللہ شہاب

حج اسلامی عبادات کا پانچواں رکن ہے۔ اور وہ ہر ایسے بالغ عاقل مسلمان پر جو اس کے لئے سفر کے اخراجات برداشت کر سکتا ہو۔ پوری عمر میں صرف ایک دفعہ فرض ہے۔ خود رسول اللہ صلعم نے ملک عرب میں رہنے کے باوجود زندگی میں صرف ایک بار حج ادا کیا تھا۔ لیکن آجکل مختلف اسباب کی بنا پر ہمارے معاشرے کے ایک طبقہ میں دولت کی فراوانی ہو گئی ہے۔ اور اگرچہ حج کا اصل مقصد ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے لیکن دولت مند لوگ زیادہ حجوں کی تعداد پر فخر کرنے کے لئے ہر سال حج کرنے پر مصر ہوتے ہیں۔ (انہیں نفلی حج کہا جاتا ہے) چونکہ ہر سال حج کے موقع پر حجاج کرام کا اژدھام بڑھتا جاتا ہے جس سے فریضہ حج ادا کرنے (اور اس کا انتظام کرنے) والوں کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس لئے سعودی عرب کے مشہور دینی ادارہ "رابطۃ العالم الاسلامی" نے یہ اپیل کی کہ نفلی حج کرنے کے بجائے متعلقہ رقم کسی دوسرے دینی مقصد کے لئے خرچ کی جائے تو زیادہ ثواب ہوگا۔ اس اپیل کی روشنی میں بہت سے اسلامی ممالک نے نفلی حج پر پابندی لگا دی ہے۔ لیکن دولتمند حضرات نے اس پابندی کو غیر مؤثر بنانے کے لئے ایک اصطلاح یعنی حجِ بدل کا سہارا لے لیا ہے۔ جس کے ذریعے ہزاروں لوگ حج پر جانے کا ذریعہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

فقہ میں حج بدل کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ اگر کوئی دولت مند مسلمان کسی خاص وجہ سے (مثلاً سخت بیماری یا حادثے کی وجہ سے) فریضہ حج ادا کرنے کے قابل نہ رہے تو وہ کسی دوسرے مسلمان کو اس مقصد کے لئے بھیج کر اپنا فریضہ پورا کر سکتا ہے۔ یا کوئی ایسا مالدار آدمی جو اپنی زندگی میں فریضہ حج ادا نہ کر سکا ہو۔ اور وفات کے وقت یہ وصیت کر جائے کہ اس کے مال سے حج بدل کرایا جائے۔ لیکن آجکل جس حج بدل کا رواج پڑ گیا ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ اس کے لئے ایسے فوت شدہ رشتہ داروں کے نام پر حج بدل کیا جاتا ہے۔ جن کی نہ تو حج کرنے کی استطاعت تھی اور نہ ہی انہوں نے حج بدل کے بارے میں کوئی وصیت کی تھی۔ واضح رہے کہ خود حج بدل کی شرعی حیثیت کے بارے میں سخت اختلاف ہے اور علمائے امت کا ایک گروہ اسے قرآن حکیم کے واضح ارشادات کے خلاف قرار دیتا ہے۔ وہ اسے عیسائیوں کے مشہور کفارہ کے عقیدے کا عکس قرار دیتے ہیں۔ جو قرآن مجید کے

اس ارشاد کے خلاف ہے کہ:-

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی - وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی - (۵۳ / ۳۸-۳۹)

"کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ اور انسان کے لئے اس کی اپنی کوشش کے سوا کچھ نہیں ہے"

جو علماء حج بدل کا جواز ثابت کرنے پر مصر تھے، انہوں نے مذکورہ بالا علماء پر معتزلہ ہونے کا فتویٰ جڑ دیا۔ خیال رہے کہ معتزلہ ان علماء کو کہا جاتا تھا۔ کہ جو ہر دینی معاملہ میں قرآن کو سند قرار دیتے تھے۔ ان کا یہ دعویٰ تھا۔ کہ قرآن حکیم میں کوئی بات خلاف عقل نہیں۔ یہ لوگ احادیث رسول اللہ سے بھی استدلال کرتے تھے۔ لیکن جو حدیث قرآن حکیم کے ارشادات سے ٹکراتی وہ اسے تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ایسی حدیث رسول اللہ صلعم کا ارشاد نہیں ہو سکتا چنانچہ علامہ آلوسی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:-

ان استدلال المعتزلة بالاٰیة علی ان العبد اذا جعل ثواب عمله - ای عمل کان لغیرہ لا ینجعل و یلغوا جعله -

(تفسیر روح المعانی جلد ۲۷ صفحہ ۶۶ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ لاہور)

"اس آیت سے معتزلہ نے یہ استدلال کیا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص اپنی عبادت کا ثواب کسی دوسرے کو منتقل کر دے۔ تو وہ ثواب منتقل نہیں ہوتا۔ بلکہ ضائع ہو جاتا ہے"

خود علامہ آلوسی معتزلہ کے استدلال کے مخالف ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ صرف معتزلہ کا مسلک نہیں۔ بلکہ امت مسلمہ کے کئی دوسرے ائمہ بھی حج بدل کے عدم جواز کے بارے میں یہی رائے رکھتے ہیں — فرماتے ہیں:-

بل قال الامام ابن الھمام ان مالکا والشافعی لا یقولان بوصول العبادات البدنیة المحضة کالصلوٰة والتلاوة بل غیرھا کالصدقة والحج - (ایضاً)

"بلکہ امام ابن ہمام (مصنف شرح فتح القدیر) نے فرمایا ہے کہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نہ صرف یہ کہ بدنی عبادات کے ثواب کی منتقلی کے قائل نہیں بلکہ صدقات اور حج کے بارے میں بھی ان کا یہ مسلک ہے۔ کہ اس کا ثواب دوسرے کو نہیں پہنچ سکتا"

صدر اسلام میں کوئی ستر کے قریب فقہی مذاہب وجود میں آ گئے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان میں سے بیشتر نسیاً منسیاً ہو گئے۔ اور صرف چار فقہی مذاہب باقی رہ گئے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ انہی (چار) میں سے دو فقہی مذاہب کے بانی تھے۔ ان کا شمار ائمہ حدیث میں بھی ہوتا ہے۔ اس لئے ان پر کسی مخالف تک نے بھی معتزلہ ہونے کا الزام نہیں لگایا۔ لیکن یہ امر غور طلب ہے۔ کہ امام مالکؒ کے استدلال کا بھی وہی طریقہ تھا۔ جسے عام طور پر معتزلہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ ہر دینی معاملے میں قرآن مجید کو سند قرار دیتے تھے۔ چنانچہ حج بدل کے جواز کے ثبوت کے لئے ان کے سامنے خثعمی عورت سے متعلق یہ حدیث پیش کی گئی۔

عن ابن عباس ان امراة من خثعم قالت یا رسول اللہ ان ابی ادرکته فریضة اللہ فی الحج

شیخا کبیرا لا یستطیع ان یستوی علی ظہر بعیرہ قال فحجی عنہ۔

(نیل الاوطار جلد چہارم صفحہ ۳۰۰ مطبوعہ مصر ۱۹۶۱ ایڈیشن)

"حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ خثعم کی ایک عورت نے حضور صلعم سے دریافت کیا کہ جس وقت اس کے باپ پر حج فرض ہوا تو وہ بڑا بوڑھا ہو چکا تھا۔ اور اس میں اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھنے کی طاقت نہیں تھی۔ آپ نے فرمایا کہ تم اس کی طرف سے حج کر لو۔"

امام مالک نے اس حدیث کو اپنے مجموعہ حدیث (مؤطا) میں شامل کیا ہے۔ لیکن اس کے خلاف جس طرح فیصلہ دیا ہے اسے امام قرطبی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:-

وقال القرطبی۔ رأی مالک ان ظاھر حدیث الخثعمیۃ مخالف للقرآن فیرجح ظاھر القرآن

(ایضا صفحہ ۳۰۲)

"امام قرطبی نے کہا ہے کہ قبیلہ خثعم کی عورت والی حدیث قرآن مجید کے واضح ارشادات کے خلاف ہے، اسلئے حدیث کے مقابلے میں قرآن کو ترجیح دی جائے گی۔"

اس طرح امام مالک علمائے اسلام کے اس گروہ کے استدلال کو صحیح قرار دیتے ہیں جن پر معتزلہ کی پھبتی کس کر ان کے استدلال کی وقعت کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خیال رہے کہ امام مالک اس وقت تک کوئی فتویٰ صادر نہیں فرماتے تھے۔ جب تک کہ وہ اس کا اطمینان نہ کر لیتے۔ کہ مدینہ منورہ کے کم از کم ستر علماء ویسی ہی رائے رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں علمائے مدینہ کی اکثریت حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کردہ مندرجہ ذیل حدیث بھی پیش کرتے تھے:-

وروی سعید بن منصور وغیرہ عن ابن عمر باسناد صحیح انہ لا یحج احد عن احد۔ (ایضاً)

"سعید بن منصور اور کچھ دوسرے راوی صحیح اسناد کے ذریعے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی جانب سے حج نہ کرے۔"

سلف صالحین نے متفقہ طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو امت مسلمہ میں سب سے بڑا متبع سنت قرار دیا ہے۔ کیونکہ وہ چھوٹی سے چھوٹی سنت پر عمل کا اہتمام اس طرح کرتے تھے جس طرح فرائض کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ منورہ کے تمام علماء حج بدل کو خلافِ اسلام قرار دیتے تھے۔

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام مالکؒ کی فقہ میں حج بدل کے خلاف جو تفصیلی احکامات ہیں ان کا متعلقہ حصہ بھی مختصراً قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے:-

قالوا الحج وان کان عبادۃ مرکبۃ من بدنیۃ و مالیۃ ولکن غلب فیہ جانب البدنیۃ فلا یقبل النیابۃ فمن کان علیہ حجۃ الاسلام وھی حجۃ الفریضۃ فلا یجوز لہ ان ینیب من یحج عنہ۔ (الفقہ علی المذاھب الاربعۃ ۱۹۵۰ء ایڈیشن جلد اول صفحہ ۵۶۵)

"مالکیہ کے نزدیک اگرچہ حج بدنی اور مالی عبادات کا مرکب ہے۔ لیکن اس میں بدنی عبادت کا حصہ غالب ہے اس لئے اس میں کسی کو قائمقام نہیں بنایا جا سکتا۔ پس جس پر حج فرض ہے۔ اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ اپنی طرف سے کسی کو حج بدل کے لئے مقرر کرے۔"

یہی نہیں بلکہ مالکی مذہب میں ایسے شخص کے نئے سرے سے حج بدل کی نوبت ہی نہیں آتی۔ کیونکہ ان کے نزدیک جو شخص حج کرنے سے معذور ہو جائے، اس سے یہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ومن عجز عن الحج بنفسہ ولم یقدر علیہ فی ای عام من حیاتہ فقد سقط عنہ الحج بتاتا

(ایضاً۔ صفحہ ۵۶۶)

"جو خود حج کرنے سے عاجز ہو گیا۔ اور زندگی کے کسی سال میں بھی اسے اس کی قدرت حاصل نہ ہوئی تو استطاعت کے باوجود، حج اس سے ساقط ہو گیا۔"

قبیلہ خثعم کی عورت والی روایت

قبیلہ خثعم کی عورت والی روایت پر گفتگو کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ امام مالکؒ نے اس روایت کو صحیح قرار دینے کے باوجود "خلاف قرآن" ہونے کی وجہ سے اسے مسترد کر دیا۔ لیکن احناف کا استدلال عجیب ہے۔ ان کا ایک گروہ حج بدل کا قائل ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اس حدیث کے ایک حصے پر عمل کرنے کو مکروہ قرار دیتا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں اس بارے میں یہ فتویٰ سامنے آتا ہے:۔

"اگر کسی کی طرف سے عورت نے حج کیا تو جائز ہے۔ اور مکروہ ہے۔ یہ محیط سرخسی میں ہے۔"

(فتاویٰ عالمگیری اردو مطبوعہ لاہور جلد دوم صفحہ ۱۱۷)

معاف فرمائیے۔ یہ سنت نبویؐ کا عجیب انداز کا احترام ہے کہ اس کے ایک حصے پر عمل مکروہ قرار دیا جائے!۔ اس کے علاوہ اس حدیث میں کافی اضطراب ہے۔ کسی روایت میں سائل عورت ہے اور کسی میں مرد۔ اسی طرح جس کے بارے میں سوال کیا گیا ہے۔ وہ بھی کہیں باپ ہے اور کہیں بہن۔ اور بعض کے نزدیک حضور صلعم کا یہ ارشاد خاص اس عورت کیلئے تھا۔ اور اس کی تائید میں وہ اس حدیث کا یہ آخری ٹکڑا پیش کرتے ہیں:۔

حجی عنہ ولیس لاحد بعدک۔ (نیل الاوطار جلد چہارم صفحہ ۳۰۱)

"اس کی جانب سے حج کر لو۔ لیکن اس کے بعد کسی کے لئے جائز نہیں۔"

حدیث میں اس اضطراب کی وجہ سے علمائے احناف نے ایک دوسری غیر متعلقہ حدیث سے استدلال کیا ہے۔ لیکن اگر اس استدلال کو تسلیم کیا جائے، تو پھر دوسرے بہت سے مسائل میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے نتیجے میں ایسے تضادات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں جن سے حج بدل کا جواز مشکوک ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے پہلے انہوں نے یہ اصول قائم کیا:۔

الاصل فی ھذا الباب۔ ان الانسان لہ ان یجعل ثواب عملہ لغیرہ صلٰوۃ وصوماً او صدقۃ او غیرھا۔ عند اھل السنۃ والجماعۃ لما روی عن النبی علیہ سلام انہ ضحی بکبشین املحین احدھما عن نفسہ والاٰخر عن امتہ۔

(شرح فتح القدیر مع ہدایہ مطبوعہ مصر جلد دوم صفحہ ۳۰۸)

"اس بارے میں اصل یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایک انسان اپنی عبادات مثلاً نماز، روزہ، یا

صدقہ وغیرہ کا ثواب دوسرے شخص کو منتقل کرسکتا ہے۔ اس کی سند وہ حدیثِ نبویؐ ہے، کہ جس میں حضور صلعم نے دو ڈبڑے مینڈھے عید قربان کے دن ذبح کئے۔ ایک اپنی طرف سے اور دوسرا ساری امت کی جانب سے۔"

اس اصول کی تائید میں قربانی والی جو حدیث پیش کی گئی ہے۔ اس پر گفتگو تو بعد میں ہوگی۔ لیکن یہاں ایک اور نکتہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان علماء سے جب یہ استدلال کیا گیا کہ جب اس اہم مسئلہ میں خود قرآن حکیم اور حضور صلعم کے واضح ارشادات موجود ہیں اور فقہاء کی ایک کثیر تعداد بھی اس قرآنی حکم کو تسلیم کرتی ہے۔ اور اس کے خلاف جو احادیث پیش کی جاتی ہیں ان کو مسترد کرتی ہے تو آپ حضرات، قرآن و سنت کے واضح احکامات کو ترک کرکے ایک غیر متعلق حدیث سے حج بدل کا جواز ثابت کرنے پر کیوں مصر ہیں۔ تو انہوں نے سرے سے قرآن حکیم کی اس آیت پر ہی ہاتھ صاف کردیا اور اس کے ثبوت میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب یہ قول پیش کیا:-

وعن ابن عباس ان الآیۃ منسوخۃ۔ (تفسیر روح المعانی جلد ۲۷ صفحہ ۶۶)

"حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے، کہ یہ آیت (لا تزر وازرۃ ... الخ) منسوخ ہے۔"

جب علمی دلائل سے یہ واضح کیا گیا، کہ یہ آیت منسوخ نہیں۔ تو پھر ایک نئی تاویل کا سہارا لیا گیا، کہ قرآن مجید کا یہ حکم بیشک واضح ہے لیکن اس کا تعلق امتِ مسلمہ سے نہیں بلکہ پہلی امتوں سے ہے اور اس کی تائید میں عکرمہ کا یہ قول نقل کیا:-

وقال عکرمۃ کان ھذا الحکم فی قوم ابراھیم و موسیٰ علیھما السلام۔ (ایضاً)

"اور عکرمہ نے کہا ہے کہ قرآن کا یہ حکم (کہ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا) حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کی امتوں کے بارے میں ہے۔"

یہ تو تھا ایک خلافِ قرآن عقیدہ اور عمل کا جواز ثابت کرنے کیلئے قرآن حکیم کے واضح ارشادات کے ساتھ سلوک اب صحیح احادیث کے ساتھ ان کا طرزِ عمل ملاحظہ فرمائیں۔ ان حضرات کو جب یہ کہا گیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کردہ صحیح حدیث کے مطابق حج بدل کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں رہتی تو انہوں نے اس بنیاد پر اس صحیح حدیث کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا کہ اس کے مقابلے میں دوسری بہت سی احادیث ہیں۔ ان احادیث میں سرفہرست خثعمی عورت والی حدیث ہے۔ اس حدیث کے متعلق ہم بتا چکے ہیں کہ اس میں جہاں دوسرے علماء کے نزدیک اضطراب ہے وہاں خود احناف اس کے آخری حصے پر عمل کرنے کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے کی دوسری غیر متعلق قربانی والی حدیث ہے۔ لیکن اس کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے ہم حنفی فقہ کے ایک بنیادی اصول، یعنی قیاس کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اہل حدیث علماء کا حنفی فقہ اور فقہاء پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ اکثر مسائل میں احادیث کو ترک کرکے قیاس یا رائے سے فیصلہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ائمہ اہل حدیث کی کتابوں میں احناف کو اہل الرائے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ یہ حضرات قیاس کے بادشاہ تھے۔ اور بعض اوقات اس سلسلے میں ایسی ایسی نکات آفرینیاں کرتے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بایں ہمہ حج بدل کے معاملہ میں انہیں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ:-

کان مقتضی القیاس ان لا تجری النیابۃ فی الحج لتضمنہ المشقتین البدنیۃ والمالیۃ۔

"قیاس کا اقتضاء یہ ہے کہ بدنی اور مالی عبادتوں کے اجتماع کی وجہ سے حج بدل جائز قرار نہیں پاتا۔" (شرح فتح القدیر جلد ۲ ص...)

لیکن یہ قیاس چونکہ ان کے خود ساختہ مسلک کے خلاف پڑتا تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی ہی فقہ کی اس اہم بنیاد کو ترک

کرکے ایسی احادیث کا سہارا لیا کہ جو ائمہ حدیث کے نزدیک ضعیف قرار پاتی ہیں خثعمی عورت والی حدیث کی تفصیلات پیش کی جاچکی ہیں۔ اب دوسری غیر متعلقہ حدیث (بابت قربانی) کو لیجئے۔ پہلی بات تو یہ ہے علمائے حدیث مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر سے ضعیف قرار دیتے ہیں:۔

هذا حديث غريب من هذا الوجه وقال المطلب بن عبد الله بن حنطب. يقال انه لم يسمع من جابر۔ (نیل الاوطار جلد پنجم صفحہ ۱۱۷)

"یہ حدیث اس وجہ سے غریب ہے کہ حدیث کے ایک راوی مطلب نے حدیث کے آخری راوی حضرت جابرؓ سے اسے نہیں سنا تھا"

اور جب علمائے حدیث کی صحیح قرار دادہ احادیث موجود ہوں تو پھر اصولاً ضعیف حدیث سے استدلال نہیں کیا جاسکتا لیکن اگر بالفرض اس حدیث کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو اس سے ایک عجیب و غریب چونکا دینے والا نتیجہ سامنے آتا ہے، حدیث یہ بیان کی جاتی ہے کہ حضورؐ نے دو مینڈھوں کی قربانی دی۔ ایک اپنی طرف سے اور دوسری ساری امت کی طرف سے۔ سو جب حضورؐ ساری امت کی طرف سے قربانی دے چکے ہیں تو پھر امت کے کسی فرد کے لئے بھی قربانی کی ضرورت باقی نہیں رہتی! سوچئے کہ یہ گہرا سوچنے کا مقام ہے۔

اپنے استدلال کی ان کمزوریوں کی وجہ سے حنفی فقہا نے کچھ اس قسم کا فتویٰ دیا کہ حج بدل کا جواز بے معنی ہوکر رہ گیا۔ امام محمد حنفی فقہ کے بانیٔ ثانی سمجھے جاتے ہیں کیونکہ فقہ حنفی انہی کے توسط سے آگے پہنچی ہے۔ انہوں نے اس بارے میں یہ فتویٰ صادر فرمایا:۔

وعن محمد رحمة الله ان الحج يقع عن الحاج وللامر ثواب النفقة لانه عبادة بدنية وعند العجز اقيم الانفاق مقامه كالفدية في باب الصوم۔

(ہدایہ مع شرح فتح القدیر جلد دوم صفحہ ۳۱۰)

امام محمد سے روایت ہے کہ حج بدل میں حج تو حج کرنے والے کا ہوتا ہے البتہ جس کی طرف سے حج کیا جاتا ہے اسے ان اخراجات کا ثواب ملتا ہے جو اس نے اس حج کے مہیا کئے تھے۔ اس کی معذوری کی وجہ سے حج کے یہ اخراجات اصل حج کے قائم مقام ہوجاتے ہیں جس طرح روزے کا فدیہ۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب حج بدل کرانے والے کا فریضہ حج ادا ہی نہیں ہوتا تو پھر ایسے حج بدل کا فائدہ کیا؟ اور متأخرین علمائے احناف کا بھی اسی فتویٰ کے مطابق عمل رہا ہے۔ علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں:۔

وعليه جمع من المتاخرين صدر الاسلام الاستيجابي وقاضي خان حتى نسب شيخ الاسلام هذا لاصحابنا فقال على قول اصحابنا اصل الحج عن المامور۔

(ایضاً صفحہ ۳۱۱)

اور متأخرین علمائے حنفیہ کی ایک جماعت کا یہی مسلک ہے جن میں امام صدر اسلام الاستیجابی اور قاضی خان شامل ہیں۔ شیخ الاسلام نے فرمایا ہے کہ حنفی فقہ کے تمام ائمہ کا یہی مسلک ہے اور ان کے اس مسلک کے مطابق حج بدل میں صرف اسی کا حج ادا ہوتا ہے جو دوسرے کے اخراجات پر حج ادا کرتا

ہے (یعنی حج بدل کرانے والے کا حج ادا نہیں ہوتا)۔

حنفی فقہ کے ایک دوسرے استدلال کی روشنی میں بھی حج بدل کا جواز مشکوک ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ یوں کہ ان کے نزدیک کسی قسم کی عبادت اجرت پر کرانی جائز نہیں۔ امام کاسانی فرماتے ہیں۔

الاستیجار علی الصوم والصلوٰۃ والحج انہ لا یصح لانہا من فروض الاعیان۔

(البدائع والصنائع ۔ جلد چہارم ۔ کتاب الاجارۃ ۔ صفحہ ۱۹۱ ۔ مطبوعہ مصر)

اجرت پر نماز، روزہ یا حج کی عبادت صحیح نہیں کیونکہ یہ عبادات فرض عین ہیں۔

حرفِ آخر

مختصراً یہ کہ قرآن مجید، حدیثِ نبوی اور فقہا کے اقوال کے مطابق شریعتِ اسلامی میں حج بدل کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس سلسلے میں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور دوسرے علمارِ اسلام کی اکثریت کا فیصلہ واضح اور دوٹوک ہے اس کے خلاف بعض علمائے احناف نے جو اس کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے تو اس سے قرآن حکیم کی ایک واضح آیت کو منسوخ قرار دینے کی نوبت آگئی۔ پھر انہیں اپنے مسلک کو ثابت کرنے کے لئے کئی تضادات کا سامنا کرنا پڑا حتیٰ کہ انہیں اس قسم کا فتویٰ دینا پڑا جس سے حج بدل کا جواز بے اثر ہو کر رہ گیا اور اس طرح حقیقت پر پردے ڈالنے کے باوجود قرآن حکیم کی یہ سچائی ابھر کر سامنے آگئی کہ کوئی انسان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور ہر ایک کے لئے اس کے اپنے عمل کے سوا کچھ نہیں۔

(پیلز)

طلوعِ اسلام

دین (یعنی قرآنی نظام) کی رُو سے "حج" امت کے نمائندگان اور مبصرین کے اجتماع کا نام ہے جس میں امت کے اجتماعی امور کے متعلق غور و فکر اور مشاورت ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے تین الفاظ میں جامع طور پر اس اجتماع کا مقصد واضح کر دیا جب کہا کہ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ۔ (۲۲/۲۸)۔ اس اجتماع سے مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں (مشاہدہ کرلیں) کہ (ان کا نظام) ان کی منفعت (مفاد) کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ حج کے اس مفہوم (و مقصود) کے پیشِ نظر "کسی کا کسی کی طرف سے حج کرنے" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن جب اسلام، دین کی جگہ مذہب بن گیا تو پھر اسلامی نظام (کے پروگرام) کے ان اجزاء کا مقصد "ثواب حاصل کرنا" رہ گیا اور پھر ثواب کے متعلق یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا کہ اسے دوسروں کی طرف منتقل بھی کیا جاسکتا ہے۔ اسے ایصالِ ثواب" کہا جاتا ہے۔ "حج بدل" بھی اسی اصل کی ایک شاخ ہے۔ اس میں حج کرنے والا، حج کے ثواب کو اس شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے جس نے اسے حج کرایا تھا۔ یعنی حج کا ثواب تو وہ لے جاتا ہے اور حاجی کہلاتا یہ ہے۔ یہ درحقیقت سرمایہ داروں کے چونچلے ہیں۔ سرمایہ دار محنت کئے بغیر محض سرمایہ پر منافع حاصل کرتا ہے۔ جو کچھ وہ دنیاوی معاملات میں کرتا ہے وہی کچھ "اخروی معاملات" میں بھی کرنا چاہتا ہے۔ وہ حج کرنے کی محنت اور مشقت

سے بچتا ہے اور کسی دوسرے کو روپیہ دے کر اس کے بدلے میں حج کا ثواب حاصل کر لیتا ہے۔ وہ "جنت خریدنے" کے بیشتر معاملات میں ایسا ہی کرتا ہے۔ یہاں مسجد بنوا دی اور بلا محنت و مشقت، محض سرمایہ کے بدلے، جنت میں گھر حاصل کر لیا۔ وقس علیٰ ذالک۔ ایصالِ ثواب کا عقیدہ اسی ذہنیت کا وضع کردہ ہے۔ روپیہ لگا کر دیگیں پکوائیں۔ اجرت پر حافظوں سے قرآن پڑھوایا اور مولوی صاحبان سے ختم دلوایا۔ اور اس سرمایہ پر منافع (یعنی ثواب)، یا تو جیتے جی وصول کر لیا اور یا مرنے کے بعد اگلی دنیا میں منگوا لیا۔

ایصالِ ثواب کا عقیدہ اپنی اصل کے اعتبار سے قرآن کریم کے قانونِ مکافاتِ عمل کے یکسر خلاف ہے۔ قانونِ مکافات کا ملخص یہ ہے کہ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۔ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۔ (۱۷/۷)۔ "اگر تم کوئی اچھا (نیک) کام کرو گے تو اس کا فائدہ تمہارے اپنے لئے ہوگا اور اگر کوئی برا کام کرو گے تو اس کا نقصان بھی تمہیں ہی اٹھانا پڑے گا"۔ بات بالکل واضح ہے۔ آپ صبح کے وقت چار میل کی سیر کرتے ہیں اس سے آپ کی صحت پر نہایت اچھا اثر پڑتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی سیر کا یہ اثر اپنے اس بھائی کی طرف منتقل کر دیں جو اس دوران میں پڑا سوتا رہتا ہے۔ آپ اپنی سیر (عمل) کا نتیجہ (خوشگواریٔ صحت) کسی دوسرے کی طرف منتقل کر ہی نہیں سکتے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۔ (۲/۲۸۶)۔ جو اچھا کام کرتا ہے اس کا فائدہ اسی کے لئے ہے۔ جو غلط کام کرتا ہے اس کا نتیجہ بھی اسی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۔ (۶/۱۶۵)۔ کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ ہے قانونِ مکافاتِ عمل۔ اپنی محنت کی (زائد از ضرورت) کمائی کو دین کے اجتماعی نظام (فی سبیل اللہ) کے لئے دے دینا ایک ایسا عمل ہے جس کا اجر (معاوضہ) خود اس عمل کے اندر مضمر ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ آپ کسی دوسرے کو روپیہ دیتے ہیں۔ وہ کچھ کام کرتا ہے اور اس کام کا اجر (ثواب) آپ کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اجر (کام کا نتیجہ) کام کرنے والے ہی کو ملتا ہے وہ کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے قانونِ مکافاتِ عمل جو دین کی اصل اور اساس ہے۔ (تفصیل ان امور کی پرویز صاحب کی کتاب "جہانِ فردا" میں ملے گی)۔

پروفیسر شہاب صاحب "مروجہ مذہب (اسلام) کے عقاید اور رسوم کا جائزہ" خود انہی حضرات کی مستند کتب کی روشنی میں لیتے ہیں اور اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ یہ کس طرح قرآن کے خلاف ہیں۔ ان کی اس قسم کی تحقیق و تدقیق اور سعی و کاوش کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ قارئین کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وضعی روایات اور فقہ کی رو سے کس طرح غلط عقاید و اعمال کو مستند بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جب کوئی اور چارہ کار نہ رہے تو قرآن کی آیات کو منسوخ قرار دینے میں بھی باک نہیں سمجھا جاتا۔

خدا ایں سخت جان را یار بادا
کہ افتاد است از بام بلندے

حضرت عمرؓ کے اس قول کے آخری الفاظ (عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی) وہ اساسِ محکم ہیں جس پر قرآن کے معاشی نظام کی عالیشان عمارت استوار ہوتی ہے اور جس کے موجود ہوتے ہوئے کمیونزم کا نظام پروان نہیں چڑھ سکتا۔ بہرحال، ان چند جھلکیوں سے جو ہم نے پیش کی ہیں، آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ جس مملکت میں اس قسم کا نظام کارفرما ہو اس کی طرف کمیونزم آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا ہے! کمیونزم تو اس سے بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ طلوعِ اسلام کنونشن بابت ۱۹۷۵ء میں پرویز صاحب نے ایک نہایت حقائق پرور خطاب ارشاد فرمایا تھا جس کا عنوان تھا — جہاں مارکس ناکام رہ گیا، اس سے آگے — اس میں انہوں نے بتایا تھا کہ مارکس نے نوعِ انسان کی معاشی مشکلات کا ایک حل تجویز کیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے کہا کہ :-

> نوعِ انسان کن مراحل سے گذر کر اور کن عملی اقدامات کی رو سے اس بلند مقصد کو حاصل کر سکے گی، اس کی بابت ہم نہ کچھ جانتے ہیں۔ نہ جان سکتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی مواد ایسا نہیں جس سے ان سوالات کا جواب دیا جا سکے۔
> کمیونزم میں ہوگا تو ایسے ہی، لیکن یہ ہوگا کیسے، اس کی بابت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے {MARX-ENGELS MARXISM BY LENIN PP. 355-56}

پرویز صاحب نے بتایا کہ اس کا جواب قرآن دیتا ہے کہ یہ کیسے ہوگا، اس سے واضح ہے کہ کمیونزم قرآن کے معاشی نظام کا حریف ہو نہیں سکتا۔ وہ تو بلکہ اس کا ممنونِ احسان ہوگا کہ جس منزل تک مارکس پہنچانا چاہتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہاں تک پہنچا کیسے جا سکے، قرآن نے نوعِ انسان کو بآسانی وہاں تک پہنچا دیا۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ جس مملکت میں قرآنی نظام رائج ہو اسے کمیونزم سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس سے تو خود کمیونزم خائف ہوگا کہ اس کی موجودگی میں اس کا چراغ جل ہی نہیں سکے گا۔ یہ وجہ ہے جو ابلیس نے کہا تھا کہ : ؎

مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

لیکن جس سرزمین میں مذہبی پیشوائیت کا رائج کردہ مذہب رائج ہو، اس پر کمیونزم کے جھکڑ کا مسلط ہونا بڑا آسان ہو جاتا ہے۔ آپ نگاہ دوڑا کر دیکھ لیجئے۔ کمیونزم انہیں ممالک میں بار پا سکا ہے جن میں اس قسم کا مذہب کارفرما تھا۔ (خواہ وہ کوئی مذہب تھا!) ہماری مذہبی پیشوائیت، کمیونزم کی مخالفت اس لئے نہیں کرتی کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ یہ اس کی اس لئے مخالفت کرتی ہے کہ اس میں ان کا وجود باقی نہیں رہتا، ورنہ جہاں تک اسلام کے خلاف ہونے کا تعلق ہے، مغرب کا نظامِ سرمایہ داری، بلکہ جمہوری نظام ایسا ہی اسلام کے خلاف ہے جیسا کمیونزم کا نظام۔ یہ حضرات، اس نظام (سرمایہ داری اور جمہوریت) کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ اسے عین مطابقِ اسلام بتاتے ہیں کیونکہ اس میں ان کا وجود باقی رہتا ہے۔ دین کے نظام میں نہ نظامِ سرمایہ داری باقی رہتا ہے نہ مغربی جمہوریت۔ نہ کمیونزم باقی رہتا ہے نہ مذہبی پیشوائیت۔ اس میں فرعون کے ساتھ قارون اور ہامان بھی دریا برد ہو جاتے ہیں۔ اس میں باقی رہتا ہے صرف قرآن کا نظام۔ لا الٰہ۔ الا اللہ سے یہی مراد ہے کیپیٹلزم، سیکولرازم، کمیونزم۔ تھیاکریسی۔ سب طاغوتی الٰہ ہیں۔ قرآنی اللہ کے سامنے ان میں سے کوئی بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ ان میں سے کسی الٰہ کی موجودگی میں، حقیقی اللہ دروازے کے اندر قدم نہیں رکھتا جب تک کعبہ سے تمام بتوں کو نکال باہر نہیں کیا تھا، اس گھر کے مالک (ربِ کعبہ) نے اس میں جھانک کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم کمیونزم کے سیلاب بے پناہ سے محفوظ رہیں تو اس کے لئے قدمِ اول یہ ہے کہ یہاں قرآنی نظام متمکن کیا جائے۔ لیکن اگر یہاں اس مذہب کی گرہیں بدستور مضبوط ہوتی گئیں جسے ہماری مذہبی پیشوائیت اسلام کے نام سے پیش کرتی ہے، تو پھر یہ کسی یلغار کا بھی مقابلہ نہیں کر سکے گا۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن (انگلینڈ)
ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)
بمقام 149 SUTTON COURT ROAD
LONDON E13 - 9NR.
PHONE 01-552-1517

لاہور میں ہر جمعہ ۸ بجے صبح (فون ۸۰۸۵۰۰)
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

کمالیہ میں ہر جمعہ ۲½ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزم (فیصل آباد) طلوعِ اسلام (بالمقابل چکی) اقبال بازار

لیہ میں ہر جمعہ کے دن بعد نماز مغرب کیپٹن غلام حیدر خاں کے مکان (نمبر ۲۵۱ وارڈ ۱) واقع عقب گلی گرلز ہائی اسکول (بذریعہ ٹیپ)

جام پور میں ہر جمعہ بعد نماز عشاء (بذریعہ ٹیپ) (ڈیرہ غازیخاں) بلوچ جنرل اسٹور۔ اڈہ روڈ

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بر مکان آغا محمد یونس صاحب رفیق لین صدر۔ بالمقابل دی آئی پی مین گیٹ پشاور سٹیڈیم اڈہ روڈ

ملتان میں ہر جمعہ صبح ۹ بجے (بذریعہ ٹیپ) (فون ۷۲۰۶۱) دفتر شاہ ستر۔ بیرون پاک گیٹ

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) (فون ۳۰۸۹۰) دفتر چوہدری شاہ نواز صاحب۔ عابد سلک انڈسٹریز (عقب اڈہ لاریاں ہائی دی جھنگی)

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار چار بجے شام بمقام ۱۲/۱/بی۔ بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی ۱۶۶ لیاقت روڈ

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) (گجرات) دفتر بزم طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

کراچی میں محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

ہر جمعہ کو ۹½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) حسبِ ذیل پتہ پر ہوتا ہے۔ جہاں ادارہ طلوعِ اسلام کی جملہ مطبوعات بھی دستیاب ہیں اور ایک پوسٹ کارڈ تحریر کر کے منگوائی بھی جا سکتی ہیں۔

محمد اسلام

کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کمرہ ۲۴۔ ہارون چیمبرز۔ الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی۔ کراچی ۲

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نظامِ حکومت

گذشتہ مارچ میں، ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا ایک انٹرویو، ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا۔ اس کا تعارف تو انٹرویو کہہ کر ہی کرایا گیا تھا لیکن وہ ایک مسلسل تقریر تھی۔ اس کا متن مختلف جرائد میں شائع ہوا۔ ہمارے سامنے اس کا وہ متن ہے جو خود مودودی صاحب کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی اپریل ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ لہٰذا اس کے مستند ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس تقریر کے بعض نکات کے خلاف مختلف گوشوں سے اعتراضات بھی ہوئے ہیں۔

ہم نے دین سے متعلق مودودی صاحب کے فرمودات کو کبھی (SERIOUSLY) نہیں لیا۔ اس لئے کہ ان کا دین، ان کی سیاست کے تابع رہتا ہے اور ان کے پیشِ نظر مصلحتوں کے مطابق اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے آج تک اسلام کے نام سے جو کچھ لکھا ہے، وہ تضادات کا مجموعہ ہے۔ زیرِ نظر تبصرہ میں بھی ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے اپنی حالیہ تقریر میں کہا ہے، وہ اس سے کس قدر مختلف اور متضاد ہے جو وہ اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ اس تبصرہ کی ضرورت بھی ہم نے اس لئے سمجھی ہے کہ ان نکات کا تعلق دین کی اساس اور بنیاد سے ہے اور اگر ان تضادات کو سامنے نہ لایا گیا تو اس سے بہت سی غلط فہمیاں بلکہ گمراہیاں پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔

اس تقریر کے موضوع کا نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ اسلامی نظامِ حکومت میں خود رسول اللہؐ کی پوزیشن کیا تھی۔ اس ضمن میں مودودی صاحب نے کہا کہ:۔

> حضورؐ کا قاعدہ یہ تھا کہ جو حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ملتا تھا اس میں تو آپ لوگوں سے بے چون و چرا اطاعت کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس میں کسی کے لئے کلام کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن جس معاملہ میں اوپر سے کوئی حکم آیا ہوا نہ ہوتا تھا اس میں آپ صحابہ سے خود بھی مشورہ فرماتے تھے۔ صحابہؓ کو بھی یہ حق دیتے تھے کہ وہ آپ کی رائے سے اختلاف کریں۔ اور بارہا ایسا ہوا ہے کہ آپ نے اپنی رائے چھوڑ کر ان کی رائے قبول فرمائی ہے۔
>
> (ترجمان القرآن۔ اپریل ۱۹۷۸ء۔ صـ۱۳)

آگے چل کر کہتے ہیں:۔

اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کو دو طرح کی تربیت دے

رہے تھے۔ ایک اس بات کی تربیت کہ جب خدا کی طرف سے کوئی حکم آئے تو اس کی بے چون وچرا اطاعت کرو۔ دوسری تربیت اس بات کی کہ جس معاملہ میں خدا کا حکم نہ ہو اس میں اہل الرائے سے مشورہ بھی کیا جائے۔ لوگوں کو بحث کا کھلا حق بھی دیا جائے۔ حضورؐ کی اپنی رائے تک سے اختلاف کرتے ہوئے دوسری رائے پیش کی جا سکے اور مشورہ کے بعد جو بات طے ہو اس پر عمل کیا جائے۔ (صفحہ ۱۴)

اور آخر میں کہا:-

اس مثال سے بھی آپ رسول اللہؐ کے طرزِ حکومت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ جن معاملات میں اللہ کا حکم ہوتا تھا وہاں کوئی جمہوریت نہ تھی۔ جن معاملات میں اوپر کا حکم نہ ہوتا تھا ان میں پوری جمہوریت تھی۔ (صفحہ ۱۴)

بات صاف، واضح اور دوٹوک ہے۔ یعنی:-

۱۔ جن امور سے متعلق خدا کی طرف سے احکام نازل ہو جاتے تھے ان میں کسی قسم کی دخل اندازی کی گنجائش نہ تھی۔ اسلامی حکومت کا فریضہ ان احکام کا نافذ کرنا تھا۔ یہ احکام اب قرآن کریم میں محفوظ ہیں، جو منزل من اللہ کتابِ خداوندی ہے ___ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل اور محفوظ۔

۲۔ جن امور میں وحیِ خداوندی نازل نہیں ہوتی تھی وہ باہمی مشورہ سے طے پاتے تھے۔ اس مشورہ میں حضورؐ اپنی رائے بھی دیتے تھے اور صحابہ کرامؓ بھی۔ اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ فیصلہ حضورؐ کی رائے کے خلاف ہو۔ اسی کا نام اسلامی جمہوریت تھی۔ ظاہر ہے کہ جو فیصلے اس طرح باہمی مشورے سے ہوتے تھے وہ وحیِ منزل من اللہ کی طرح ہمیشہ کے لئے غیر متبدل نہیں ہوتے تھے۔ مشورہ سے طے کردہ امور میں، حالات کے بدل جانے سے، مشورہ سے تبدیلی ہو سکتی تھی۔

لیکن جب اسلامی نظامِ حکومت کا یہی نقشہ (پہلے) علامہ اسلم جیراجپوری ؒ۔ اور ازاں بعد طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کیا گیا تو مودودی صاحب نے طوفان برپا کر دیا کہ یہ انکارِ حدیث ہے، انکارِ رسالت ہے۔ الحاد ہے۔ بے دینی ہے۔ ارتداد ہے اور نہ جانے کیا ہے۔ اس موضوع پر طول طویل بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:-

لیکن یہ تفریق جو انہوں نے محمدؐ بن عبداللہ بحیثیت انسان اور محمدؐ رسول اللہ بحیثیت مبلّغ کے درمیان کی ہے قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں۔ قرآن میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول اور نبی ہونے کی حیثیت ہے۔ جس وقت اللہ تعالےٰ نے آپ کو منصبِ رسالت سے سرفراز کیا' اس وقت سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ اسی حیثیت میں آپ مبلّغ اور معلّم بھی تھے۔ مربّی اور مزکّی بھی تھے۔ قاضی اور حاکم بھی تھے۔ امام اور امیر بھی تھے۔ حتیٰ کہ آپ کی نجی اور خاندانی اور شہری زندگی کے سارے

معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آگئے تھے ..... قرآن مجید میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ انسانی اور حیثیتِ امارت میں کوئی فرق کیا گیا ہو ..... رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے (ہوتی تھی) ..... آنحضرت جس وقت، جس حالت میں، جو کچھ بھی کرتے تھے رسول کی حیثیت سے کرتے تھے۔

(تفہیمات۔ حصہ اوّل۔ ۱۹۵۹ء ایڈیشن۔ صفحہ ۲۴۳-۲۴۱)

اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

(رسول کی) زندگی کے معاملات، عام اس سے کہ وہ امام کی حیثیت سے ہوں یا امیر کی حیثیت سے۔ قاضی کی حیثیت سے ہوں یا معلّمِ اخلاق کی حیثیت سے۔ شہری اور سوسائٹی کے ایک فرد کی حیثیت سے ہوں یا ایک شوہر، باپ، بھائی، رشتہ دار اور دوست کی حیثیت سے۔ سب پر اس کی حیثیتِ رسالت اس طرح حاوی ہوتی ہے کہ کسی حال میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے منفک نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ جب وہ اپنی خلوت میں اپنی بیوی کے پاس ہوتا ہے اس وقت بھی اسی طرح خدا کا رسول ہوتا ہے جس طرح وہ مسجد میں نماز پڑھاتے وقت ہوتا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۶۰)

آپ غور فرمائیے کہ جو کچھ مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا ہے اور جو کچھ تفہیمات میں لکھا تھا، ان میں کس قدر تضاد ہے۔ اور یہ تضاد بھی حقہ کے کسی فروعی مسئلہ میں نہیں۔ حضور نبی اکرم کی پوزیشن کے متعلق ہے۔ یعنی اس سوال کے متعلق جس پر دین کی عمارت استوار ہوتی ہے اور جس کے مطابق اسلامی نظامِ حکومت کو قیامت تک قائم ہونا ہے۔

مودودی صاحب نے جو کچھ تفہیمات میں لکھا ہے اس کی رو سے، حضور کے لئے کسی وقت اور کسی معاملہ میں بھی دوسروں سے مشورہ کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ کیونکہ ایک رسول کا دوسرے لوگوں سے مشورہ کرنے کا کیا مطلب۔ لیکن اس باب میں مودودی صاحب کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ قرآن کی وہ آیت تھی جس میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو حکم دیا تھا کہ: شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) "اور ان امور میں، ان لوگوں (اپنے ساتھیوں) سے مشورہ کیا کرو"۔ اس ضمن میں مودودی صاحب نے لکھا:۔

لیکن رسول اللہؐ کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ بھی کہ دیا گیا ہے کہ جب آپ کسی بات کا عزم فرمالیں تو خدا پر بھروسہ کر کے عمل کا اقدام فرمائیے۔ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (۳/۱۵۹) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ مشورہ کے محتاج نہ تھے بلکہ آپ کو شوریٰ کا حکم صرف اس لئے دیا گیا تھا کہ آپ کے مبارک ہاتھوں سے ایک صحیح جمہوری طرزِ حکومت کی بنیاد پڑ جائے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۴۵)

ہم مودودی صاحب کی اس مضحکہ انگیز تاویل پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب

نے اپنی حالیہ تقریر میں فرمایا ہے کہ جن امور میں خدا کی طرف سے حکم نازل نہیں ہوتا تھا، ان میں آپ اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اس مشورہ میں آپ کی بھی ایک رائے ہوتی تھی۔ اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ فیصلہ آپ کی رائے کے خلاف ہو۔ آپ اس فیصلہ پر عمل بھی فرماتے تھے۔ اس کا نام اسلامی جمہوریت تھا؟

سوال یہ ہے کہ رسول اللہؐ کی حقیقی حیثیت وہ تھی جس کا اظہار تفہیمات میں کیا گیا تھا یا وہ جسے حالیہ تقریر میں بیان کیا گیا ہے؟

اگلا اہم ترین سوال، اسلامی نظامِ حکومت میں قانون سازی کا ہے۔ اس باب میں مودودی صاحب نے اپنی حالیہ تقریر میں کہا ہے:۔

> اس کے بعد مقننہ کا مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ جو دین رسول اللہ لائے تھے اس میں چونکہ بنیادی طور پر قانون اللہ تعالےٰ کا تھا اور وہی قانون بنانے کا حق رکھتا تھا اس لئے رسول اللہ کی حیثیت قانون ساز کی نہ تھی، بلکہ قانون کو نافذ کرنے والے، اس کی تشریح کرنے والے اور لوگوں کو اس کے مطابق عدل و انصاف کا نظام چلانے کی تربیت دینے والے کی تھی۔
> ..... اس لئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضورؐ خود قانون ساز نہیں تھے۔ بلکہ اصل قانون اللہ تعالےٰ کا تھا اور آپ اس کے مقرر کردہ سرکاری شارح تھے۔
> (ترجمان القرآن۔ بابت اپریل ۱۹۷۸ء۔ صـ۱۵)

بات بالکل واضح ہے۔ لیکن جب یہی بات طلوعِ اسلام نے کہی تھی تو مودودی صاحب نے لکھا تھا:۔

> حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر یہ مراد ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسر کی ہے۔ یعنی وہ انہی مسائل و وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً قرآن میں ذکر آ گیا ہے اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے ..... مسائل و احکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔
> (ترجمان القرآن۔ بابت جولائی۔ اگست۔ ستمبر ۱۹۵۰ء)

دوسرے مقام پر لکھا:۔

> حضورؐ نے استاد کی حیثیت سے جو کچھ بتایا اور سکھایا ہے وہ اسی طرح خدا کی طرف سے ہے جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے۔ اس کو "غیر از قرآن" کہنا صحیح نہیں ہے۔
> (تفہیمات۔ حصہ اوّل۔ صـ۳۳۶)

آپ غور فرمائیے کہ اس باب میں مودودی صاحب نے جو کچھ پہلے لکھا تھا اور جو کچھ اب فرمایا ہے، ان میں کس قدر تضاد ہے۔ اور (جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے)۔ تضاد بھی کسی فرعی مسئلہ میں نہیں ——— ایسے اہم سوال میں ہے جس کا تعلق نظامِ حکومتِ اسلامی کی

اساس و بنیاد پر ہے۔

سوال یہ کیا گیا کہ کیا اسلامی نظام ڈنڈے کے زور پر نافذ کیا جائے گا۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا:۔

اسلامی قانون میں ڈنڈے کا بھی ایک مقام ہے مگر وہ سب سے آخر میں آتا ہے۔ اسلام میں ترتیب کار یہ ہے کہ پہلے ذہنوں کی اصلاح کا کام تعلیم و تلقین کے ذریعے سے کیا جائے تاکہ لوگوں کے خیالات تبدیل ہوں۔ پھر لوگوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر کام کیا جائے، یہاں تک کہ محلے محلے، بستی بستی، اور کوچے کوچے میں ایسے لوگ تیار ہو جائیں جو بدکرداریوں کو عوام کی مدد سے دبائیں اور اپنے اپنے علاقوں کے باشندوں میں دین داری اور دیانت داری پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح ملک کے اندر ایک ایسی رائے عام پیدا ہو جائے گی جو برائیوں کو سر نہ اٹھانے دے گی۔ کوئی شخص ایسی عام رائے کی موجودگی میں بگڑنا چاہے گا تو اس کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی اور جو شخص صحیح طرز زندگی اختیار کرے گا اس کو پورا معاشرہ مدد دینے والا ہو گا۔ اس کے ساتھ اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ معاشرہ ایسا ہو جس کے لوگ ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار ہوں۔ ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آنے والے ہوں۔ ہر شخص انصاف کا حامی اور بے انصافی کا مخالف ہو۔ ہر شخص اپنے اوپر پیٹ بھرنا حرام سمجھے اگر اس کو معلوم ہو کہ اس کا ہمسایہ بھوکا سو رہا ہے۔ پھر اسلام ایک ایسا معاشی نظام بھی قائم کرتا ہے جس میں سود حرام ہو، زکوٰۃ فرض ہو، حرام خوری کے دروازے بند کر دیئے جائیں، رزق حلال کمانے کے لئے تمام مواقع لوگوں کے لئے کھول دیئے جائیں اور کوئی آدمی اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ ہونے پاتے۔ ان تدابیر کے بعد ڈنڈے کا مقام آتا ہے۔ ایمان، اخلاق، تعلیم، انصاف، اصلاحِ معیشت، اور ایک پاکیزہ رائے عام کے دباؤ سے بھی جو آدمی درست نہ ہو تو وہ ڈنڈے ہی کا مستحق ہے۔ اور ڈنڈا پھر اس پر ایسی بے رحمی کے ساتھ علی الاعلان چلایا جائے کہ ان تمام لوگوں کے دماغ کا آپریشن ہو جائے جو جرائم کے رجحانات رکھتے ہوں۔ (ترجمان القرآن۔ اپریل ۱۹۷۸ء۔ صفحہ ۶۹)

اس کے بعد کہا:۔

لوگ بڑا غضب کرتے ہیں کہ اسلام کے پروگرام کی ساری تفصیل چھوڑ کر صرف اُس کی سخت سزاؤں پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ اسلام پہلے عام لوگوں میں ایمان پیدا کرتا ہے۔ پھر عوام کے اخلاق کو پاکیزہ بناتا ہے۔ پھر تمام تدابیر سے ایک ایسی مضبوط رائے عامہ تیار کرتا ہے جس میں بھلائیاں پھلیں پھولیں اور برائیاں پنپ نہ سکیں۔ پھر وہ معاشرتی اور معاشی اور سیاسی نظام

ایسا قائم کرتا ہے جس میں بدی کرنا مشکل اور نیکی کرنا آسان ہو جائے۔ وہ اُن تمام دروازوں کو بند کرتا ہے جن سے فواحش و جرائم نشو و نما پاتے ہیں۔ اس کے بعد ڈنڈا وہ آخری چیز ہے جس سے ایک پاک معاشرے میں سر اٹھانے والی ناپاکی کا قلع قمع کیا جاتا ہے۔ اب اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے کہ ایسے برحق نظام کو بدنام کرنے کے لئے آخری چیز کو پہلی چیز قرار دیتا ہے اور بیج کی سب چیزوں کو ایمان کی طرح نگل جاتا ہے۔ (ایضاً۔ ص ۲۲-۲۱)

لیکن اس سے پہلے انہوں نے وکلاء کانفرنس (منعقدہ مئی ۱۹۷۶ء) سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

میں واضح طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا نفاذ اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کو اقتدار سے ہٹایا جائے اور ملک کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہیں، دل سے مانتے بھی ہیں اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں اور جس روز ان کے ہاتھ میں اقتدار آئے گا اس کے دوسرے روز اسلامی احکام نافذ ہو جائیں گے۔

اس وقت نہ اخلاقی تربیت کا سوال تھا۔ نہ معاشرہ کی تدریجی اصلاح کا۔ اقتدار ان کے ہاتھ میں دو اور دوسرے ہی دن اسلامی قوانین نافذ ہو جائیں گے۔

جہاں تک سزاؤں کا تعلق ہے، انہوں نے اپنے کتابچہ "مرتد کی سزا" میں لکھا ہے:۔

جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دیدیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں، مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا۔ اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا، اسے قتل کر دیا جائے گا۔ (کتابچہ "مرتد کی سزا: اسلامی قانون میں" اگست ۱۹۵۳ء ایڈیشن ص ۷۶)

ہم نے شروع میں کہا تھا کہ اس تبصرہ سے مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ مودودی صاحب کے بیانات میں کس قدر تضاد ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں آپ کے سامنے آگئیں۔ سوال یہ تھا کہ رسول اللہ نے کس قسم کا نظامِ حکومت قائم فرمایا تھا۔ جب اس نظام کے متعلق اس قسم کی متضاد باتیں کہی جائیں تو سوچئے کہ اس عظیم امر کا فیصلہ کس طرح کیا جا سکے گا کہ حضورؐ کے قائم فرمودہ نظامِ حکومت کا نقشہ کس قسم کا تھا۔ اور جب یہی طے نہیں کہ اس نظام کے اصولی اور بنیادی خط و خال کس قسم کے تھے تو پاکستان میں "نظامِ مصطفیٰ" قائم کرنے کا دعویٰ کیا حقیقت رکھتا ہے۔ مودودی صاحب کے یہ تضادات اس ایک مسئلہ میں ہی نہیں اسلام سے متعلق جو امور بھی سامنے آئیں گے ان میں ان کا یہی مسلک نظر آئے گا۔ اس موضوع پر ہمارے پیشِ نظر ایک مفصل تصنیف ہے جسے اپنے وقت پر شائع کیا جائے گا۔ سردست اتنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

نقد و نظر

۱۔ اقبالؒ اور قرآن

طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ، پرویز صاحب کے مجموعۂ مقالات و خطابات پر، جناب رئیس امروہوی کا تبصرہ، جو روزنامہ جنگ (کراچی) کی اشاعت بابت ۲۱ اپریل ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا، اور جسے ہم معاصر مذکور کے شکریہ کے ساتھ درجِ ذیل کرتے ہیں:۔

اقبال اور قرآن کے موضوع پر جناب غلام احمد پرویز نے جس فکری گہرائی۔ نظریاتی اخلاص اور سوزِ قلب کے ساتھ روشنی ڈالی ہے امر واقعہ یہ ہے کہ اس کی مثال معاصر علمی و فکری ادب میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ اقبال اور قرآن (ادارہ طلوعِ اسلام، ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور) مطالعاتِ اقبال کے سلسلے میں نادر اور غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ پرویز صاحب نے تعلیماتِ قرآن کی روشنی میں فکرِ اقبالؒ کا جائزہ لیا ہے اور وہ تیس پینتیس سال سے اس فکر کی نشر و اشاعت اور اس پیغام کی تشریح و تفسیر میں مصروف ہیں۔ تین سو صفحے کی یہ ضخیم کتاب ان مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً طلوعِ اسلام میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ کون واقف نہیں کہ طلوعِ اسلام اور جناب غلام احمد پرویز نے اقبال شناسی کی تحریک کو عام کرنے میں یادگار حصہ لیا ہے۔ اس کتاب کے عالمانہ محاسن اور مفکرانہ معیار کا اندازہ صرف اس کے بغور مطالعہ سے ممکن ہے۔

جناب امروہوی کے اس تبصرہ پر ہم اس سے زیادہ اور کیا عرض کریں کہ:

دیدہ ام مردے دریں قحط الرجال!

غنیمت ہے کہ اس قوم میں، لومۃ لائم سے بے باک ہو کر کسی کو تو حق گوئی کی جرأت نصیب ہوئی!

۲۔ افکارِ ملّی

محترم چوہدری نذیر احمد خان صاحب، حلقہ طلوعِ اسلام میں محتاجِ تعارف نہیں۔ اس سے پہلے اس مجلہ میں ان کی دیگر تصانیف پر تبصرے زیبِ دہ اوراق ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر تالیف ان کے ان مقالات۔ خطابات و تقاریر کا دلآویز مجموعہ ہے جو گذشتہ پچیس تیس سال میں مختلف اوقات میں، مختلف جرائد وغیرہ میں چھپتے رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں سعید حلیم پاشا کی زبان سے کہا ہے: ؎

غربیان را زیرکی سازِ حیات — شرقیان را عشق رازِ کائنات

زیرکی از عشق گردد حق شناس — کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ — عشق را با زیرکی آمیز دہ

جناب چوہدری صاحب عشق و زیرکی کا وہ آمیزہ ہیں جس کی شہادت ان کے اس مجموعہ مقالات سے ملتی ہے۔ ان میں بعض مقالات، بصیرت نواز اور خرد افروز ہیں تو دیگر خطابات جگر سوز اور دلگداز ہیں۔ ان میں اگر بعض تحریریں ماضی کے بھولے ہوئے افسانوں کی یاد تازہ کراتی ہیں، دوسری تقریریں، حال کے مسائل کو سمجھنے کے لئے قندیلِ راہ کا کام دیتی ہیں۔ رنگا رنگ کے پھولوں کے اس مجموعہ کو غالب کے الفاظ میں، دامانِ باغبان و کفِ گلفروش سے بجا طور پر تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ یا پندِ پیر (اقبالؒ) کی عمل پیرائی جس میں کہا گیا ہے کہ:-

سحر در شاخسارِ بوستانے — چہ خوش می گفت مرغِ نغمہ خوانے

برآور ہر چہ اندر سینہ داری — سرودے، نالۂ، آہے، فغانے

فیروز سنز لمیٹڈ (لاہور) نے اس مجموعہ کو اس کے شایانِ شان طریق سے شائع کیا ہے۔ اور قیمت فی (مجلد) نسخہ -/۶۴ روپے مقرر کی ہے۔ ہمیں ان سے ایک شکایت ضرور ہے کہ انہوں نے پروف ریڈنگ میں ضروری احتیاط نہیں برتی جس سے قدم قدم پر نگاہ میں "کھٹک" پیدا ہوتی ہے۔

۳- "FOOD AND HYGIENE IN ISLAM"

ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب، اپنی داد سے بیگانہ وار، قرآنی فکر کو انگریزی زبان میں پیش کرنے کے "جنونِ خرد افروز" میں بیش از بیش آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے ان کی دو نہایت اہم اور ضخیم کتابیں، اندرون اور بیرونِ ملک کے اربابِ دانش سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ اب انہوں نے اس مختصر سے کتابچہ میں، جسمانی طہارت اور غذائی پاکیزگی جیسے بظاہر پیش پا افتادہ لیکن درحقیقت بڑے بنیادی مسائل کو قرآنی روشنی میں اس طرح بیان کیا ہے جس سے قاری غیر محسوس طور پر اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ اس خارجی صفائی اور پاکیزگی کا، انسان کی داخلی نشوونما کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق ہے۔ غذا اور بدن کی پاکیزگی کے علاوہ، اس میں خمر (شراب) کے مضرات اور روزہ کے مصالح سے متعلق بھی بصیرت پرور بحث کی گئی ہے۔

یہ کتابچہ صوری حیثیت سے بھی بڑا جاذبِ نظر ہے۔

قیمت:- (فی جلد) آٹھ (-/۸) روپے

ملنے کا پتہ:- خالد پبلشرز۔ ۳۲- نسبت روڈ۔ لاہور